شیخ الحدیث حضرت مولانا
مئی ۱۹۹۹ء

اے بی سی آڈٹ بیورو سرکولیشن کی مصدقہ اشاعت

جلد نمبر: 34
شمارہ نمبر: 8,7
ذی الحجہ ۱۴۱۹ھ محرم ۱۴۲۰ھ
اپریل، مئی ۱۹۹۹ء

ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک

مدیر اعلیٰ: حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

نگران: حضرت مولانا انوار الحق صاحب مدظلہ

مدیر: حافظ راشد الحق سمیع حقانی

ناظم شفیق الدین فاروقی

اس شمارے کے مضامین

نوٹ: یہ مجلہ دو ماہ یعنی اپریل، مئی کے شماروں پر مشتمل ہے۔ قارئین نوٹ فرمالیں۔ (ادارہ)

ماہنامہ الحق دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک ضلع نوشہرہ (سرحد) پاکستان۔ فون نمبر: 630435 , 630340 -(0923)

ای میل نمبر E-Mail : haqqania@psh.infolink.net.pk

سالانہ بدل اشتراک اندرون ملک فی پرچہ =/15 روپے سالانہ =/150 روپے، بیرون ملک 20$ امریکی ڈالر

مولانا سمیع الحق مہتمم دارالعلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک، منظور عام پریس پشاور

نقش آغاز

حافظ راشد الحق سمیع حقانی

مسلمانان کوسووٴ پر اہل مغرب کی یلغار اور عالمِ اسلام کی شرمناک بے حسی

مسلمانان عالم کو اس وقت عہد حاضر کی مشکل ترین اور صبر آزما صورتِ حال درپیش ہے اس وقت خطہ ارض پر مظلوم ترین قوم صرف اور صرف ملت اسلامیہ ہی ہے اس کا وجودِ مسعود پورے کا پورا زخم زخم بن چکا ہے۔ لیکن پھر بھی یہ مظلوموں کی صف میں شمار نہیں ہوتا۔ کہیں تو استعمار اور اس کے گماشتوں نے اس کو اپنے شکنجے میں دبوچا ہوا ہے اور کہیں خود اس کے اپنے ہی ناداں اس کے وجود کو صفحہ ہستی سے مٹانے پر تلے ہوئے ہیں۔

اپنے منقاروں سے حلقہ کس رہے ہیں جال کا
طائروں پر سحر ہے صیاد کے اقبال کا

آج کے "مہذب دور" میں ظلم و ستم کی تمام ایجادیں اور بربریت کی سفاکانہ رسمیں انہی بدنصیب مسلمانوں کیلئے ہیں۔ ابھی تو افغانستان، چیچنیا، بوسنیا، کشمیر اور فلسطین کے زخم بھرنے بھی نہ پائے تھے اور ملت اسلامیہ کے آنگن میں لاشوں کے ڈھیر ابھی تک لگے ہوئے تھے۔ نہ مظلوم اور یتیم بچوں اور بے سہارا بیواؤں کی چیخ و پکار اور آہ و بکا مدھم ہونے پائی تھی کہ ایک اور قیامت برپا کر دی گئی اور امت مسلمہ کے وجود پر ایک اور کاری وار آج کے "مہذب ترقی یافتہ اور انسانی حقوق کے علمبردار" مغرب نے کر دیا تاکہ بیسویں صدی کی اختتامی شام بھی مسلمانوں کے خون سے لہو رنگ ہو جائے۔ اور متحدہ یورپ اس تماشہ کا خوب خوب لطف اٹھا سکے۔ یورپ کے قدیم آرتھوڈکس متعصب، عیسائی سرب درندوں نے گذشتہ ایک عشرے سے مسلمانان یورپ پر جو مظالم ڈھائے ہیں تاریخ انسانی میں اس کی نظیر مشکل سے ملتی ہے۔ مسلمانان کوسووٴ پر ان کے جرائم کچھ نئے نہیں بلکہ اس سے قبل ان کا نشانہ ستم بوسنیا کے مظلوم مسلمان بن چکے ہیں۔ اسی خون کی چاٹ اور درندگی کی کھ

اجازت نے سربوں کو اور بھی جرأت دلادی۔ اور وہ یوگوسلاویہ کے ایک اہم حصے کوسووجس میں بیس لاکھ کے قریب مسلمان صدیوں سے آباد چلے آرہے تھے ان پر جھپٹ پڑے۔ یورپ کے ان درندوں نے مسلمانوں کو اس طرح ختم کرنا شروع کردیا گویا کہ یہ ان کی نظروں میں انسان نہیں بلکہ پوست کی موذی فصلیں ہوں۔ جنہیں کاٹنا اور جلانا ان کے نزدیک کار ثواب ہے۔ اب تک کوسووٴ میں تقریباً ڈیڑھ لاکھ کے قریب نہتے مسلمانوں کو تہہ تیغ کردیا گیا ہے۔ سات لاکھ تیس ہزار مسلمانوں کو جبری جلاوطن کردیا گیا ہے۔(اور وائس آف امریکہ کے مطابق تقریباً پانچ لاکھ مسلمان لاپتہ ہیں) جو پڑوسی ممالک مقدونیہ اور البانیہ میں پناہ لینے پر مجبور ہوگئے ہیں۔ اس میں زیادہ تعداد عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کی ہے۔ جہاں سلطنت عثمانیہ کے جاہ و جلال کے وارث کھلے آسمانوں کے نیچے بے یار و مددگار پڑے ہوئے ہیں۔ کوسووٴ میں مسلمانوں کے اکثریتی علاقے جلادئے گئے ۔ درخت اور فصلیں اجاڑدی گئیں۔ عمارتیں زمین بوس کردی گئیں۔ مسلمان ماؤں اور جوان بہنوں کی عصمتوں کے آبگینے چکنا چور کردیے گئے۔ بچوں کے حلق میں سنگینیں اتاری گئیں۔ نوجوانوں کو ٹینکوں کے نیچے روندا گیا۔ الغرض ان دنوں یورپ کی سرزمین مسلمانوں کیلئے محشر کا میدان بن چکی ہے۔ کوسووٴ میں قیامت سے پہلے قیامت برپا کردی گئی اور ابھی تک یہ شیطانی عمل اور رقص ابلیس جاری وساری ہے۔ مسلمانوں کے ازلی دشمن امریکہ اور اس کے حواری (اتحادی) مغربی ممالک کی تنظیم نیٹو یہ تماشہ ستم گذشتہ دس برس سے دیکھ رہے تھے۔ لیکن اس پر کوئی کاروائی سربوں کے خلاف ضروری نہیں سمجھی گئی اور سربوں کو ظلم و بربریت کی مکمل آزادی بلکہ شہ دی جاتی رہی۔ قتل و غارت گری کی اس گرما گرمی کے دوران یوگوسلاویہ کے وحشی درندے صدر ملاسوچ گورنمنٹ سے مہینوں پیرس وغیرہ میں مذاکرات کا طویل ڈھونگ رچایا گیا اور اس دوران زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کا قتل عام کیا جاتا رہا۔ پھر جب خون کی ندیاں اتر چکیں تو نیٹو اور امریکہ نے جعلی فضائی حملوں کا ناقص ترین پروگرام بنایا۔ آخر انہیں "انصاف اور منصفی" کے تقاضے بھی پورے کرنے تھے۔۔۔۔۔

مٹ جائیگی مخلوق تو انصاف کرو گے   منصف ہو تو اب حشر بپا کیوں نہیں کرتے

امریکہ اور نیٹو کے یہ دکھاوے کے فضائی حملے سربوں کیلئے مزید تقویت کا باعث بن گئے۔ اس آڑ میں انہوں نے اپنی مکمل فوج کو سوؤ پر چڑھادی اور پورے کوسوؤ اور اس کے گردونواح میں مسلمانوں کی نسل کشی شروع کردی۔ یورپ کے ان بیچارے مسلمانوں کا جرم صرف یہ ہے کہ

ع　اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں

طرفہ تماشہ یہ کہ یوگوسلاویہ کے اکثریتی علاقوں کو خود مختاری دی جاچکی ہے لیکن جب مسلمانوں نے علم حریت بلند کیا تو یوگوسلاویہ' یورپ اور امریکہ یہ برداشت نہ کرسکے کہ ایک بار پھر قلب یورپ میں ایک اسلامی اور خود مختار حکومت قائم ہو' کیونکہ اگر یہ پودا دوبارہ ہرا ہو گیا تو پھر اس کے برگ وبار اور ثمرات کو یورپ میں پھیلنے سے کون روک سکے گا۔

عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں
کہ یہ ٹوٹا ہوا تارا مہ کامل نہ بن جائے

یورپ کبھی بھی مسلمانوں کو دوبارہ سپین کی تاریخ دہرانے کی اجازت نہیں دیگا۔ کیونکہ چند مسلمانوں کی اخلاقی اور معاشرتی زندگی نے بغیر دعوت و تبلیغ کے لاکھوں عیسائیوں کو شجر اسلام کے سایہ عافیت میں پناہ لینے پر مائل کردیا تھا۔ پھر بعد میں بلقان کے خطے میں کچھ ترک آباد ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے اسلام کی بہاریں پھیلتی چلی گئیں۔ اور یورپ کا تاریک ترین صنم کدہ نور اسلام کی آفاقی کرنوں سے جگمگا اُٹھا۔ اور یوں چراغ سے چراغ جلنے کا ایک سلسلہ چل پڑا اور رفتہ رفتہ اکثریتی علاقے اسلام کے زیرنگیں آتے گئے۔

سرب درندوں کو انتقام کی آگ نے بھی جُھلسایا ہوا ہے۔ انہیں ماضی میں ترکوں کے ہاتھوں پے درپے شکستوں کا غم بھی ستارہا ہے۔ پھر ان تنگ نظر آرتھوڈوکس عیسائیوں کو صلیبی جنگوں کی شکستیں بھی نہیں بھولیں جب سلطان صلاح الدین ایوبی نے ان کے چھکے چھڑادیے تھے۔ مغرب نے طویل انتظار اور منصوبہ بندی کے بعد مسلمانوں پر ہلہ بولا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کو پالیا ہے کہ عالم اسلام کی قیادت بے غیرت اور بے حمیت بن چکی ہے۔ صلاح الدین ایوبی اور فاتح محمد کے جانشین ہمارے پالتو بن چکے ہیں۔ ان کی رگ حمیت بے حس ہو چکی ہے۔ انکی

غیرت ایمانی سو چکی ہے، عیش و طرب کے اژدہانے انہیں بری طرح جکڑا ہوا ہے۔ انکے تمام وسائل امریکہ اور یورپ کے ہاتھوں میں آچکے ہیں۔ انکی نگاہوں میں عالم اسلام اب منتشر اور ڈری ہوئی بھیڑوں کا ایک ایسا ریوڑ بن چکا ہے جسے یہ درندے اور بزدل گیدڑ آسانی کے ساتھ ایک ایک کر کے دبوچ رہے ہیں۔ اب کسی مسلمان بہن کی پکار پر کوئی محمد بن قاسم آنے والا نہیں۔ بلکہ لاکھوں مسلمان بہنیں اپنے مسلمان بھائیوں کو مدد کیلئے پکار رہی ہیں لیکن نوجوانان اسلام کرکٹ کے ہنگاموں اور لہو و لعب کے تماشوں میں مصروف ہیں۔ انہیں اس سے کیا سروکار۔ او۔ آئی۔ سی۔ کا اجلاس بھی جینوا میں نشتند و گفتند و برخاستند کی رسم ادا کر کے ختم ہو گیا۔ ایران جو اپنے آپ کو مغرب کا دشمن اور صف اول کا بہادر سمجھتا ہے اور اس کے صدر او۔ آئی۔ سی کے صدر بھی ہیں۔ اس موقع پر اسلامی غیرت اور حمیت کا مظاہرہ نہیں کیا۔

عالم اسلام کے حکمرانوں کی بے غیرتی ملاحظہ فرمائیں کہ ماضی میں اپنے برادر اسلامی ملک جو عراق پر تو امریکہ اور مغرب کے ساتھ قتل و غارت گری میں شامل ہو گئے تھے۔ لیکن اب کوسوؤ کے مسئلہ پر سب خاموش ہیں۔ بھلا ایک عیسائی فوجی دوسرے ہم مذہب عیسائی بھائی کو کوسوؤ میں کیا مارے گا۔ اور وہ کس خلوص اور کس جذبہ کے ساتھ کوسوؤ کے مسلمانوں کا تحفظ کرے گا۔ بلکہ یہ فریضہ تو عالم اسلام کی افواج کا ہے۔ لیکن معلوم نہیں کہ ہم انہیں کس بازار سے غیرت ملی خرید کر لا دیں۔ اور کہاں سے ان کیلئے جوش ایمانی حاصل کریں۔ لیکن افسوس کہ یہ جنسِ گراں بازاروں میں دستیاب نہیں۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ سرب درندوں کی مسلمانوں کے ساتھ دشمنی و عداوت بہت پرانی ہے۔ ۱۳۴۹ء سے اس کشمکش کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اور تقریباً سو سال تک ان کے درمیان مخاصمت چلتی رہی۔ لیکن ۱۳۶۲ء میں ایک عثمانی جرنل لالہ شاہین نے بلغاریہ کا شہر فلوپوپولس فتح کیا۔ تو یہ لوگ چوکنا ہو گئے۔ اور پوپ اربن پنجم نے ترکوں سے نمٹنے کیلئے یونانی کلیسا کے نام پر متعدد ممالک کی افواج کو اکٹھا کیا۔ ترک سلطان مراد اول کے بہادر جرنل لالہ شاہین نے اس لشکر کو تہ تیغ کر دیا۔ اور عظیم فتح سے ہمکنار ہوئے۔ ۱۳۶۳ء کی شکست فاش کے آٹھ سال بعد پھر سربیا اور

بلغاریہ نے مل کر مسلمانوں پر ۱۳۷۱ء میں حملہ کرنا چاہا لیکن اسی شاہین صفت لالہ شاہین نے سربیائی اور بلغاروی فوجوں کو صفحہ ہستی سے مٹادیا۔ پھر ۱۳۸۵ء میں سلطان مراد نے بلغاریہ پر حملہ کر کے اسکے پایہ تخت صوفیہ کو فتح کیا تو اسکے شہنشاہ سیسمان نے سلطان مراد کے گھٹنے پکڑ کر اس سے معافی مانگی۔ ترک مسلمانوں کی فتوحات کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر اسی کوسوؤ میں ۱۳۸۹ء میں ترکوں نے سرب درندوں کی فوج کو کو آخری معرکہ میں شکست فاش دی۔ اور یہاں تک کہ سربیا کے بادشاہ لازار شا کو بھی قتل کر دیا۔ اس دوران ترکوں نے سربیا پر مکمل قبضہ کر لیا۔ ساٹھ سال بعد ایک بار پھر کوسوؤ کا علاقہ میدان جنگ بن گیا۔ عیسائی اپنی شکست پر اندر ہی اندر سلگ رہے تھے۔ انہوں نے ۸۰ ہزار صلیبی افواج کو ترک سلطان مراد ثانی کے مقابلے میں لا کھڑا کیا۔ لیکن امت مسلمہ کے اس بہادر فرزند نے ۸۰ ہزار کے لشکر کو گاجر، مولی کی طرح کاٹ ڈالا۔ اور سربیا کو اپنا باج گزار بنالیا۔ ان تمام جنگوں میں مسلمانوں نے اسلامی جنگی قوانین کے مطابق اپنے دشمنوں کے ساتھ سلوک کیا۔ ان کی خواتین، بچوں اور بے گناہ لوگوں کے ساتھ کسی قسم کا ناجائز برتاؤ نہیں کیا گیا۔ لیکن صدیوں بعد ملاسوچ کے "دل کی آگ" بھڑک اٹھی اور یہ بے حمیت اور بزدل درندہ بے گناہ شہریوں اور معصوم بچوں سے انتقام لینے پر تل کیا گیا ہے۔ ان انتقامی کاروائیوں میں یورپ کی تمام عیسائی حکومتوں کا درپردہ سربوں کے ساتھ تعاون رہا ہے۔ اس کے علاوہ روس بھی بلغراد کا بھرپور ساتھ دے رہا ہے۔ کیونکہ بلغراد مشرقی یورپ میں کمیونزم کا ایک اہم ساتھی رہا ہے۔ روس اسکی ہر ممکن امداد پر تلا ہوا ہے بلکہ اس کے بحری بیڑے بھی سمندروں میں ممکنہ جنگ کی صورت میں حصہ لینے کیلئے پہنچ گئے ہیں۔

چین اور بھارت دونوں مکمل طور پر بلغراد کا ساتھ دے رہے ہیں۔ دراصل شطرنج کی اس بساط پر ایک بہت بڑا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ اور بیچ میں مسلمانوں کو ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق ختم کیا جا رہا ہے۔ امریکہ اور نیٹو مسلمانوں کو یہ دکھا رہا ہے کہ ہم مسلمانوں پر ہونے والے مظالم کا بدلہ لے رہے ہیں۔ لیکن اصل بات یہ ہے کہ امریکہ اور نیٹو بلغراد سے اپنا سابقہ حساب چکا رہے ہیں۔ کہ بلغراد نے کیوں روس کا ساتھ دیئے رکھا۔ بلکہ اب بھی اس کا حامی ہے۔ لہذا پرانا غصہ

اب اس آڑ میں نکالا جا رہا ہے۔ ہم امریکہ اور نیٹو کا اخلاص اس وقت مانیں گے، جب وہ سربوں کے خلاف اپنی بری افواج کو کوسوو میں بھیجیں گے اور جنگی تاریخ کے بڑے مجرم ملاسوچ کو سزائے موت دینگے اور جلاوطن مسلمانوں کے لاکھوں خاندانوں کو دوبارہ کوسوو میں آباد کر کے دکھائیں گے۔ اور کوسوو کے مسلمانوں کی آزاد اور خود مختار اسلامی حکومت کو تسلیم کریں گے تو تب ہی ان کے مشکوک کردار کی پوزیشن واضح ہو گی۔ ورنہ ہم اسے نورا کشتی ہی سمجھیں گے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

حضرت الشیخ رحمہ اللہ کے خاندان کو صدمہ

آپ کے بھائی جناب نور الحق صاحبؒ کا انتقال

13۔اپریل بروز بدھ بوقت پانچ بجے حضرت شیخ الحدیث صاحب رحمہ اللہ کے خاندان کو ایک عظیم سانحہ سے دوچار ہونا پڑا۔ آپ کے بھائی جناب نور الحق صاحبؒ مختصر علالت کے بعد اس جہان فانی سے انتقال کر گئے۔ نماز جنازہ چار بجے ظہر شہر کے بڑے میدان میں ہوئی جس میں ہزاروں علماء، صلحاء اور عوام نے شرکت کی اور بعد از نماز جنازہ اپنے آبائی قبرستان میں والدین مرحومین کے پہلو میں سپرد خاک کر دئے گئے۔ مرحوم انتہائی نیک سیرت سادہ مزاج اور فقیر منش انسان تھے۔ بعض وجوہات کی بنا پر آپ اپنا تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔ مگر تمام عمر علماء اور طلباء کی خدمت میں گزاری۔ موجودہ وقت میں آپ خاندانِ شیخ رحمہ اللہ کے معدودے چند بزرگوں میں سے تھے۔ جن پر حضرت الشیخ رحمہ اللہ کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ حضرت الشیخؒ کی اپنے بھائی کے ساتھ انتہائی محبت تھی اور برادر خورد ہونے کے ناطے حضرتؒ آپ کے ساتھ شفقت و محبت کا معاملہ فرماتے۔ حضرتؒ آپ کو اپنے سے جدا تصور نہیں کرتے تھے۔ ان کے درمیان اخوت و مؤدت کا ایک لازوال اور اٹوٹ رشتہ تادم واپسیں قائم رہا۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں اعلیٰ علیین عطا فرمائے اور ان کے پسماندگان کو صبر جمیل کی دولت سے نوازے۔ آپ کی وفات پر کسی قسم کی تشہیر نہیں کی گئی تھی۔ اخبارات اور ریڈیو کے ذریعہ بھی

اطلاع نہیں دی گئی تھی۔ مگر اس کے باوجود جب لوگوں کو معلوم ہوا تو حضرت الشیخؒ کے عقیدت مندوں کی ایک کثیر تعداد نے جنازہ میں شرکت کی سعادت حاصل کی اور آج تک تعزیت کرنے والوں کا سلسلہ جاری ہے۔ دارالعلوم حقانیہ کے مہتمم حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ نائب مہتمم حضرت مولانا انوار الحق صاحب، مرحوم کے صاحبزادہ احتشام الحق صاحب اور دیگر صاحبزادگان ان تمام حضرات کے شکر گزار ہیں جنہوں نے بغیر کسی اطلاع کے جنازہ میں شرکت کر کے حضرت الشیخؒ کے خاندان کے ساتھ اپنی لازوال محبت کا ثبوت دیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
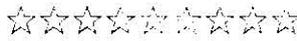
مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی مدظلہ کی علالت

گذشتہ دنوں ہندوستان کے متعدد رسائل و جرائد سے یہ افسوسناک اور حزن و درد میں ڈوبی ہوئی اس خبر نے تڑپا دیا کہ حضرت پر فالج کے حملہ کا اثر ہوا ہے۔ اور آپ وہاں کے مقامی ہسپتال میں داخل کر دیے گئے ہیں۔

حضرت مدظلہ کی شخصیت پورے عالم اسلام کیلئے ایک شجر سایہ دار کی مانند ہے۔ اور اس پر بہار درخت پر باد سموم کا معمولی جھونکا بھی ہمارے لیے ناقابل برداشت حد تک تکلیف دہ ہوتا ہے۔ عالم اسلام کی زبوں حالی اور موجودہ حالات میں آپکی شخصیت اور آپکا وجود مسعود ہمارے لیے اور بالخصوص مسلمانان ہند کیلئے انتہائی ضروری ہے۔ آپ کی عبقریت اور ہمہ گیریت کیوجہ سے نہ صرف برصغیر بلکہ عالم عرب آپ کے علمی مقام کا شیدا اور گرویدہ ہے۔ ایک مرید دور افتادہ اور ہجر و فراق کے درد کے مارے ہوئے عاشق کیلئے یہ خبر وحشت اثر کتنی غم انگیز ہوگی اس کا اندازہ اس شخص کو ہو سکتا ہے جو اس قسم کے حوادث سے دوچار ہوا ہو۔ ہم ہزاروں میل دور رہ کر اللہ کے حضور دست سوال دراز کرتے ہوئے صرف یہی دعا کر سکتے ہیں کہ

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

☆☆☆☆☆☆

آخری قسط
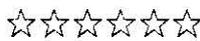
حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مدظلہ

اہل علم اور طلبۂ علوم دینیہ کی ذمہ داریاں

حضرت قتادہؒ نابینا علماء میں سے ہیں۔ ان نابینا علماء نے بھی دین کی بہت خدمت کی ہے۔ علامہ ابن عبدالبرؒ نے کتاب "العلم والعلماء" میں ان علماء کا ذکر کیا ہے کہ ان نابینا علماء نے مستقل تصنیفات کی ہیں فرماتے ہیں کہ حضرت قتادہؒ کو وقت کا بہت احساس تھا۔ کھانے کے وقت کا بھی اسکو احساس ہوتا تھا اور اس پر روتے تھے کہ کھانے میں بھی وقت ضائع ہوتا ہے اگر اس کو مطالعہ اور دوسرے دینی امور میں صرف کرتے تو اچھا ہوتا یہاں تک کہ پاخانہ کے وقت کا بھی احساس تھا حالانکہ یہ طبعی امور ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں جن لوگوں نے ترقی کی ہے ان لوگوں کے ساتھ وقت کا احساس تھا چاہے وہ یہودی ہوں یا عیسائی یا کسی اور مذہب کے ہوں۔ ایک انگریز جس کا نام پروفیسر آرنلڈ ہے۔ وہ علی گڑھ یونیورسٹی میں پڑھاتے تھے اور علامہ اقبالؒ وغیرہ حضرات کے اساتذہ میں سے ہیں۔ انہوں نے اسلام کے بارے میں بھی ایک کتاب لکھی جس کا نام دعوت اسلام (The preaching of Islam) ہے۔ کسی زمانہ میں اس پروفیسر آرنلڈ اور علامہ شبلی نعمانیؒ نے ایک سمندری جہاز میں سفر کیا، اس وقت کے اکثر سفر سمندری جہازوں سے ہوتے تھے۔ انہوں نے سفر نامہ مصر اور سفر نامہ شام میں لکھا ہے کہ ایک دفعہ جب وہ دونوں سمندری سفر میں تھے تو پروفیسر آرنلڈ کا اپنا کمرہ تھا اور علامہ شبلی نعمانیؒ کا اپنا کمرہ تھا اس لئے کہ سمندری جہاز کا سفر مہینوں جاری رہتا تھا۔ سفر کے دوران جہاز کے ایک حصے میں آگ لگ گئی۔ جہاز میں ہنگامہ کھڑا ہوا اور جہاز ڈوبنے لگا۔ ہم سب اس افراتفری میں تھے کہ جہاز ڈوب رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ اپنی فکر لگی ہوئی تھی۔ نفسی نفسی کی حالت تھی اس لئے پروفیسر آرنلڈ ہم سے بھول گئے اس لئے کہ وہ کمرہ میں مطالعہ میں مشغول تھے کچھ وقت بعد خیال آیا کہ پروفیسر آرنلڈ کو تو بالکل خبر نہیں لہذا ہم دوڑ کر ان کے پاس گئے اور ان کو اطلاع دی کہ جہاز ڈوب رہا ہے اور ہم یہ دیکھ کر حیران ہوئے کہ اس وقت بھی وہ مطالعہ میں مشغول تھے۔ جب ہم نے صورت حال ظاہر کی تو اس نے کہا کہ جب جہاز ڈوب رہا

ہے تو میں کیا کروں، پھر تو مجھے چھوڑ دو تاکہ اس صفحہ کی تکمیل کروں اور اپنا مطالعہ پورا کروں، اس لئے کہ ڈوبنے کا تو کوئی علاج نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ پروفیسر آرنلڈ کون تھے؟۔ اپنے امام ابو یوسفؒ کو دیکھو کہ جب اس دنیا سے رخصت ہو رہے تھے تو اس وقت شاگرد عیادت کرنے آئے۔ جب شاگردوں سے بات ہونے لگی تو امام ابو یوسفؒ نے پوچھا کہ رمی ماشیا افضل ہے یا راکبا افضل ہے۔ (یہ ابواب الحج کے مسائل ہیں) تو شاگردوں نے بتایا کہ آپ کو اس وقت بہت تکلیف ہو رہی ہے اور یہ وقت ان مسائل کے چھیڑنے کا نہیں۔ اس لئے کہ آپ نے دین کی بہت خدمت کی ہے۔ آپ نے ساری زندگی فقہی مسائل تلاش کرنے میں صرف کی ہے اور ہزاروں فرضی (متوقع) مسائل کی وضاحت کی ہے (جو ابھی تک واقعہ بھی نہیں ہوئیں ہیں) لیکن پھر بھی آپ نے انکا حل بیان فرمایا اس لئے یہ وقت ان مسائل کا نہیں تو امام ابو یوسفؒ نے فرمایا کہ ایک مسئلہ واضح ہو جائے اس کے ساتھ مرنا افضل ہے یا یہ کہ ایک مسئلہ مجمل رہ جائے تو جب شاگردوں سے یہ بات چیت ہوئی اور شاگرد گھر سے نکل رہے تھے تو جب یہ طلباء گھر کے دروازے پر پہنچے تو گھر سے رونے کی آواز شروع ہوئی اور معلوم ہوا کہ امام ابو یوسفؒ دنیا سے تشریف لے گئے۔ تو امام ابو یوسفؒ حالت نزع میں بھی دینی مسائل میں مشغول رہے اور چونکہ ان حضرات کے ساتھ وقت کا احساس تھا اس لئے دین کی وہ خدمت کر کے گئے جن کی نظیر مشکل ہے تو اب آپ کو بھی وقت کی قدر کرنا ضروری ہے اور یہ وقت ایک امانت ہے۔ قیامت کے دن اللہ پاک یہ بھی پوچھیں گے کہ اپنی جوانی کس چیز میں مشغول رکھی: "عن شبابه فی ما ابلاہ" بہر حال اپنے وقت کی قدر کرو۔ بہت ناقدرے طلباء ایسے ہوتے ہیں جو اپنی پڑھائی کے اوقات کو سیاست میں گزارتے ہیں حالانکہ ہم خود پسند نہیں کرتے کہ دارالعلوم میں سیاست کریں۔ ہمارا مقصد یہ ہے کہ یہاں صرف تعلیمی ماحول ہو اس لئے طلباء کو یہاں دارالعلوم مین سیاست سے دور رہنا ہوگا اور جب فراغت ہو جائے تو پھر سیاست کریں لیکن یہ اوقات خالص پڑھائی کے اوقات ہیں ان میں تمام مشاغل کو ختم کریں اور اپنے آپ کو صرف اور صرف پڑھائی کی طرف متوجہ کریں، لیکن اس بات کو ذھن نشین رکھیں کہ آپکی سیاست جو بھی ہو اس کو اپنے اندر رکھیں۔ اس لئے کہ مدرسے کا ایک مسلک ہے اور ایک سیاست ہے اس

لئے اس سیاست کے ساتھ آپکے سیاسی تصادم کو برداشت نہیں کر سکتے۔ اگر میری یعنی مہتمم کی ایک سیاست ہو اور آپکی دوسری سیاست ہو تو اس سے جامعہ کی بے عزتی ہو گی، اس لئے آپ کو سیاست سے دور رہنا ضروری ہے۔ بنیادی طور سے میں آپ حضرات کیلئے سیاست کو پسند نہیں کرتا۔ میں نے کبھی طلباء کو اپنے جلسے میں بھیجنے کا نہیں کہا کہ یہ طلباء میرے لئے مظاہرے کریں اور جلوس نکالیں، بلکہ یہ ضروری ہے کہ آپ خالص علم حاصل کریں اس لئے کہ دارالعلوم کو اللہ پاک نے بہت صفات اور کمالات سے مخصوص کیا ہے۔ سیاست وغیرہ ٹیپ ریکارڈ سننا، اور دیگر خرافات وغیرہ ان سب باتوں کو چھوڑ دیں۔ مدرسہ تو اتنی سختی نہیں کرتا اور آپ حضرات چونکہ عاقل اور بالغ ہیں اس لئے مدرسہ والے ہاتھ میں ڈنڈا نہیں اٹھاتے کہ آپ کے پیچھے گھومتے پھرتے رہیں بلکہ آپ خود سوچیں کہ ہم کس لئے آئے ہیں۔ ہمارے والد محترمؒ کا یہ فلسفہ تھا اور فرماتے تھے کہ ضابطہ سے رابطہ اچھا ہے یعنی ربط و محبت سے طلباء کو سمجھانا اچھا ہے اس لئے ضروری ہے کہ آپ بھی ہمارے ساتھ تعاون فرمائیں تو ان سے آپ لوگوں کو بھی بہت فائدہ پہنچے گا اور دارالعلوم کے عملہ کو بھی آسانی رہیگی۔ اس کے علاوہ تحصیل علم کیلئے بنیادی چیز ادب ہے۔ استاد کا ادب کرنا بہت ضروری امر ہے: "من علمنی حرفا فھو مولای" فرماتے ہیں کہ جس نے مجھے ایک حرف بھی سکھایا وہ میرا آقا ہے اور اسکی خاصیت یہ ہے کہ جو طالب جتنا استاد کا ادب کرے گا اس کا علم اتنا پھیلے گا۔ ہمارے والد محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا عبدالحق نور اللہ مرقدہ بہت مثالیں بیان فرمایا کرتے تھے۔ وہ فرماتے تھے کہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کے پاس ہزاروں طلباء تھے۔ انہی میں حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ بھی تھے لیکن چونکہ مولانا حسین احمد مدنیؒ اپنے استاد کا احترام کرتے تھے ان کا علم تمام اطراف عالم میں پھیلا اور دوسرے حضرات جو اساتذہ کا ادب نہ کرتے تھے تو سکول کے ماسٹر اور معمولی عہدے دار بنے تو ادب کی وجہ سے جو درجہ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کو ملا وہ دوسرے طلباء کو نصیب نہ ہوا۔

شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ فرمایا کرتے تھے کہ میں اپنے استاد حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ کی بہت خدمت کرتا اور ان کے ساتھ احترام سے پیش آتا تو مجھ پر طلباء ہنستے تھے کہ یہ

خوشامد کرنے والا ہے اور اپنے نمبر بناتا ہے، لیکن میں انکی پرواہ نہیں کرتا تھا۔ آج وہ لوگ کھیتوں میں اور دنیا میں مشغول ہیں اور ان کا کوئی فیض دنیا کو نہیں پہنچتا۔ اس لئے والد محترم فرمایا کرتے تھے کہ "الدین کلہ ادب" کہ دین سراسر ادب کا نام ہے اور اسی ادب سے رشتے قائم ہیں۔ میں نے جو سند بیان کی اور حضرت شیخ الحدیث مولانا عبدالحقؒ سے شروع کی تو اسکی وجہ یہ تھی کہ وہ کنکشن (Connection) حضرت والدؒ سے لیکر حضرت محمد ﷺ تک پہنچے اس لئے کہ حضرت محمد ﷺ پاور ہاؤس ہیں اور آپ حضرات کھمبے اور یہ اسفار مرہیں انہی نسبتوں سے یہ علم ہم کو پہنچا ہے تو گویا اس سند کو اس لئے بیان کیا جاتا ہے تاکہ سلسلہ اور سند حضرت محمد ﷺ تک پہنچ جائے۔ اور دورہ حدیث میں مقصودی چیز سند متصل کرنا ہے۔ علمی ابحاث سے زیادہ اہم چیز یہ ہے کہ ایک حدیث بھی بغیر اتصال کے نہ رہ جائے۔ بعض طلباء ایسے بھی ہوتے ہیں جو ہفتوں درس میں حاضر نہیں ہوتے اور یہ سوچتے ہیں کہ کسی ساتھی سے کاپی لیکر دیکھ لینگے حالانکہ سند کا متصل کرنا بہت اہم ہے کہ حدثنا عن فلان عن فلان : یعنی اس طریقے سے یہ حدیث ہم تک پہنچتی ہے اور جو حدیث رہ جائے وہ سند تو بغیر اتصال کے رہ جاتی ہے تو گویا وہ سند تو حضور اقدس ﷺ کو نہ پہنچی اور بیچ میں سے کنکشن منقطع ہوا۔ اسلئے یہاں پر دوران سال سرد الحدیث ہوتی ہے تو ہر طالب علم کو ضروری ہے کہ بلاناغہ تمام دروس میں شریک رہے۔

تو محترم بھائیو! جس طرح میں نے آپ کے سامنے عرض کیا کہ استاد کا ادب ضروری ہے کہ اگر آپکی معمولی بے ادبی اس کے ساتھ شامل ہو جائے تو اس سے آپ کے حصول علم میں کمی آئیگی۔ حضرت والدؒ صاحب فرمایا کرتے تھے کہ امام سرخسیؒ بہت بڑے امام گزرے ہیں وہ کسی مقام کو تشریف لے گئے تو جن طلباء کو معلوم ہوا فوراً اسکی خدمت میں حاضر ہوئے ان میں سے ایک طالب علم تاخیر سے آیا تو ان سے تاخیر کی وجہ پوچھی تو اس نے بتایا کہ انکی والدہ بیمار تھی اور انکی خدمت میں مصروف تھا اس لئے دیر ہو گئی اور ماں کی خدمت کی وجہ سے مجبور تھا اس لئے جلدی حاضر نہ ہو سکا تو امام سرخسیؒ نے فرمایا کہ آپکی عمر زیادہ ہو گی اور باقی حضرات کا علم پھیلے گا تو گویا خاصیت بیان کی کہ جو استاد کا ادب کرے تو اس کا علم پھیلے گا اگرچہ والدین کی خدمت بھی ضروری

ہے لیکن اساتذہ کے ساتھ تعلق اور انکے ادب سے علم میں برکت ہوتی ہے۔ حضرت مولانا قاسم نانوتویؒ نے ایک مرتبہ افسوس سا ظاہر کیا کہ نانوتہ میں میرا فلاں رشتہ دار ہے وہ کس حالت میں ہوگا اور نانوتہ کا علاقہ دیوبند سے بہت دور تھا۔ مولانا قاسم نانوتویؒ نے یہ کلمات ویسے ہی کہے لیکن پاس ہی مولانا محمود الحسنؒ بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے یہ کلمات سنے اس وقت ارادہ کیا کہ جاکر اپنے استاد کے رشتہ دار کا حال معلوم کر لوں کہ کس طرح ہوگا۔ گویا وہ اساتذہ کے منشا کے مطابق عمل کرتے تھے۔ دوسری طرف نانوتہ کا علاقہ دیوبند سے بہت دور تھا۔ راستے میں گھنے جنگل تھے۔ وحشی حیوانات کا ڈر تھا۔ رات کا اندھیرا تھا لیکن پھر بھی حضرت مولانا محمود الحسنؒ چپکے سے نانوتہ روانہ ہوئے تاکہ استاد کو خبر دے، چنانچہ رات بھر سفر کیا اور اسکے حالات پوچھے اور راتوں رات واپس ہوئے۔ صبح جب مولانا قاسم نانوتویؒ مدرسہ میں وضو فرمارہے تھے تو شیخ الہندؒ نے ان سے فرمایا کہ رات آپ نے جس رشتہ دار کے بارے میں پریشانی ظاہر کی تھی اب اللہ کے فضل سے وہ صحیح ہیں۔ حالانکہ شیخ الہندؒ دیوبند کے ایک بڑے امیر شخص کے بیٹے تھے اور ان کے والد انگریزوں کے زمانے کا افسر تھا اور شیخ الہندؒ کو بہت ناز و نعم میں پالا لیکن شیخ الہندؒ کی یہ حالت تھی کہ جب استاد کی پریشانی کا حال معلوم ہوا تو راتوں رات سفر کیا اور حالات سے ان کو باخبر کیا۔

انگریزوں نے شیخ الہندؒ اور دوسرے علماء کرام کو مالٹا (مقام کا نام) میں قید رکھا اور ان حضرات کو گرفتار کرنے میں شاہ حسین (شہنشاہ اردن) کے دادا کا کردار سرفہرست ہے کہ انہوں نے انگریزوں کو آگاہ کیا اور ان پاک ہستیوں کو مالٹا میں چار سال تک قید رکھا اور انہوں نے مالٹا جیل میں مختلف قسم کی تکالیف برداشت کیں۔ اسیری کے دوران شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ بہت بیمار ہوگئے تھے اور چونکہ ضعیف تھے اس لئے تہجد کے وقت ٹھنڈے پانی سے وضو کرنا بہت مشکل تھا۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے جب یہ دیکھا کہ حضرت شیخ الہندؒ کو ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے میں تکلیف ہوتی ہے تو ہر رات چپکے سے پانی کا برتن لیتے اور اس برتن کو اپنے سینے سے پیوست کرتے تاکہ بدن کی حرارت سے اس کی ٹھنڈے پن میں کمی آجائے۔ لہذا مولانا حسین احمد مدنیؒ رات بھر بیٹھے رہتے اور اس برتن کو اپنے بدن سے لگائے رکھتے اور تہجد کے وقت اس پانی کو شیخ الہندؒ کی

خدمت میں پیش کرتے جس سے وہ وضو فرماتے تو گویا مولانا حسین احمد مدنیؒ خود تو تکلیف برداشت کرتے لیکن کوشش یہ ہوتی کہ استاد کو راحت پہنچے تو یہ ہمارے اسلاف کے ادب کا ایک نمونہ ہے۔
تو اب آپ کو بھی اساتذہ کا ادب واحترام ضروری ہے اس طرح دار العلوم کا ادب کرنا بھی ضروری ہے حتیٰ کہ دار العلوم کے چپڑاسی کا ادب کرنا بھی ضروری ہے۔ یہ تمام حضرات آپ کے خادم ہیں۔
بڑے بڑے علماء کے بارے میں سنا ہے کہ وہ دیوبند اور گنگوہ کی طرف پاؤں پھیلا کر نہ سوتے تھے او یہ فرماتے تھے کہ یہ دونوں مراکز ہمی اور قبلہ علمی ہیں۔ ایک عبادت کا قبلہ ہے اور ایک علم کا قبلہ ہے تو میرے بھائیو! یہ دار العلوم بھی قبلہ علمی ہے اس کا احترام آپ تمام حضرات پر لازم ہے او آج بھی ایسے بہت حضرات ہیں وہ جب دار العلوم تشریف لاتے ہیں تو سڑک پر جوتیاں اتارتے ہیں تاکہ دار العلوم اور قبلہ علمی کی ناقدری نہ ہو۔

اب اہم بات یہ ہے کہ چونکہ طالبان کی وجہ سے ساری دنیا میں آپ حضرات کا نام اونچا ہو گیا ہے اس لئے مختلف قسم کے لوگ آئینگے اور آپکے حالات کو دیکھیں گے کہ یہ کس طرح لوگ ہیں۔ آج امریکہ سے، اسٹریلیا سے، جرمنی سے، برطانیہ سے لوگ آتے ہیں تاکہ آپ لوگوں کو دیکھیں کہ طلباء کیا چیز ہیں جنہوں نے ساری دنیا میں ایک ہل چل مچا رکھی ہے۔
گذشتہ سال میرے پاس ایک وفد آیا تاکہ طلباء کے حالات معلوم کریں کہ یہ کس طرح کی مخلوق ہے؟ ان خبیثوں نے یہ پروپیگنڈہ کیا ہے کہ یہ طالبان ایک "غلیظ اور گندی شے" ہے۔ ان کے سینگ بھی ہیں ان کے بڑے بڑے دانت ہیں اور پیچھے سے دم کو تلاش کرتے ہیں کہ کتنی لمبی ہو گی اور ان کا یہ تصور نہیں ہے کہ طلباء انسان ہونگے اور جب ان کو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام بھی ہیں تو بہت حیران ہوئے اور کہتے ہیں کہ مولانا کیا ان کے نام بھی ہیں اور آکر یہ بیان کرتے ہیں کہ مغربی ممالک میں یہ تصور ہے کہ طلباء بھیڑ، بکریوں کی طرح ایک مخلوق کا نام ہے۔ لیکن میرے بھائیو! یاد رکھو یہ چند دن کا پروپیگنڈہ ہے جو ختم ہو جائیگا۔ اس لئے آج صحابہ کی طرح حالت پیدا ہو گئی ہے۔ گذشتہ زمانے میں دنیا کے لوگ صحابہ کے ساتھ ہنستے بھی تھے اور انکے بارے میں پوچھتے بھی تھے کہ یہ کس طرح کھاتے ہیں کس طرح پیتے ہیں اور اپنے خصوصی جاسوس بھیجتے تھے

۔ میرے ساتھ جو یہودی اور عیسائی آتے ہیں تو مجھ سے ملا عمر کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ کس طرح کا آدمی ہے۔ اس کے کان کس طرح ہیں، اسکی ناک کس طرح ہے۔ بعض حضرات تو یہ کہتے ہیں کہ ملا عمر ہے ہی نہیں بلکہ آپ لوگوں نے مقامات کی طرح ایک ڈرامہ بنایا ہے۔ اگر وہ ہوتے تو باہر کیوں نہیں نکلتے۔ آج دنیا کو تجسس ہے کہ وہ کہاں ہے ؟۔ تو آج تمام دنیا آپ کے خلاف ہے۔ آپ کے بارے میں معلومات حاصل کرتی ہیں کہ انکی خوراک کیا ہے۔ یہ علم کس طرح سیکھتے ہیں اور ۲۴ گھنٹے آپ کا جائزہ لے رہے ہیں۔ ہمارے والد محترمؒ کے ساتھ غم تھا کہ جب طالب علم کسی محلہ کو جائے گا تو لوگ گھور گھور کر دیکھیں گے اس لئے فرماتے تھے کہ بازاروں میں ایک دوسرے کو آواز نہ دو اور ہوٹلوں میں نہ بیٹھو لیکن آج تمام عالم کفر طلباء کے خلاف ہے اور سمجھتے ہیں کہ ان کا سب سے بڑا دشمن طالب علم ہے اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ دارالعلوم حقانیہ ان کا مرکز ہے، اس لئے بیدار رہ کر وقت گزارنا ہو گا۔ یہاں پر دوسری بنیادی چیز صفائی ہے۔ مدرسے والے بھی کوشش کرتے ہیں لیکن آپکے تعاون کی ضرورت ہے لہذا اپنے کمروں کو صاف رکھیں اور جو گندگی ہو اس کو کمروں کے باہر نہ پھینکیں بلکہ جو ڈرم پڑے ہوں اس میں گندگی ڈالیں۔ اسی طرح کمرے میں (پلاسٹک شاپر) رکھیں اور اس میں غیر ضروری اشیاء ڈالیں اسلئے کہ جب گندگی ہو گی تو مچھر پیداء ہونگے اور پھر آپ حضرات کو تکلیف ہو گی۔ کاغذوں کو نیچے نہ پھینکو بلکہ اس کو محفوظ رکھو اور جب بہت جمع ہو جائیں تو ان کو جلائیں اس لئے کہ ہر کاغذ میں ضرور بضرور اللہ اور رسول ﷺ کا نام لکھا ہوتا ہے اور جب ہم اس کو نیچے پھینکتے ہیں تو ظاہر ہے کہ وہ پاؤں کے نیچے آئیگا اور گناہ کا سبب ہو گا اس لئے جب علم کو آئے ہو تو ان چیزوں کا احترام کرو جن سے علم حاصل ہوتی ہے۔ کتابوں میں واقعہ لکھا ہے کہ ایک جاہل شخص تھا جو علم سے بالکل خالی تھا۔ ایک دن اس نے ایک کاغذ نیچے پڑا ہوا دیکھا جس پر اللہ کا نام لکھا ہوا تھا وہ بہت رویا کہ اللہ کا نام نالی میں پڑا ہوا ہے۔ لہذا اس نے کاغذ کو اٹھایا اور اسکو دھویا لیکن وہ بہت روتا رہا۔ رات کو سوئے اور جب صبح اٹھے تو عربی پڑھنے لگے حالانکہ وہ بالکل جاہل اور ان پڑھ تھے تو کہنے لگے کہ :"امسیت کردیا واصبحت عربیا" تو کاغذ کے احترام کی وجہ سے رات ہی میں اللہ نے نیند میں عالم بنایا۔ جب سونے لگے تو کردی تھے اور جب صبح ہوئی تو عالم بن

گیا تھا۔ تو ایک کاغذ کی احترام کی وجہ سے اللہ نے علم نصیب فرمایا۔

آج جامعہ کے مصارف بہت زیادہ ہو گئے ہیں۔ تمام اساتذہ کرام نے مشورہ کیا کہ داخلہ میں کمی کی جائے۔ لیکن میرا دل یہ نہیں چاہتا کہ کوئی شخص محروم رہ جائے۔ اخراجات کی وجہ سے گذشتہ سال ایک ایک مہینہ بہت تکلیف سے گزرا اس لئے گذشتہ سال کے پیش نظر یہ طے پایا کہ گذشتہ تعداد سے نصف تعداد میں داخل کرایا جائے لیکن ہم نے گذشتہ سال سے زیادہ طلباء کو داخلہ دیا ہے تاکہ کوئی علم سے محروم نہ رہ جائے اور طلباء چونکہ اللہ کے مہمان ہیں اس لئے اللہ پاک خود بندوبست فرمائیں گے۔ "انا نحن نزلنا الذکر وانا له لحفظون" تو اب چونکہ تعداد زیادہ ہو گئی ہے اس لئے ایک دوسرے کو جگہ دیں۔ ایک دوسرے کی تکالیف کو برداشت کریں۔ ایک دوسرے کو کھانے میں شریک کریں۔ حضرت والد صاحب نور اللہ مرقدہ فرمایا کرتے تھے کہ "طعام الواحد یکفی لاثنین" یعنی ایک کا کھانا دو افراد کیلئے کافی ہو جاتا ہے تو ایک دوسرے کو اپنے ساتھ شریک کرو تاکہ کوئی محروم نہ رہ جائے۔ بجلی کا خرچہ بھی بہت زیادہ ہے۔ لاکھوں کے حساب سے بل آتے ہیں جس طرح مطبخ کا ماہانہ خرچہ لاکھوں تک آتا ہے تو دوسری طرف بجلی کا بل بھی لاکھوں تک پہنچتا ہے۔ اس لئے بجلی کے بارے میں آپ محتاط رہیں، جو فضول بتی جل رہی ہو اس کو بجھاؤ، ہیٹر اور استری کا استعمال نہ کریں۔ اس لئے کہ دارالعلوم کی طرف سے اسکی اجازت نہیں اور جو استعمال کرتے ہیں وہ حرام استعمال کرتے ہیں۔ حضرت والد صاحبؒ کے زمانے میں پنکھے نہ تھے بجلی کا خرچہ کم تھا۔ اور بعد میں آپ لوگوں کی خاطر ہم نے پنکھے لگائے تاکہ آپ کو راحت ہو جسکی وجہ سے بجلی کا خرچہ بہت زیادہ ہو گیا ہے۔ اگر آپ حضرات تعاون نہ کرینگے تو شائد بل کی زیادتی کی وجہ سے بجلی کٹ جائے پھر آپ کے تعلیم و تعلم میں کمی آئیگی لہذا ان باتوں کا اہتمام کریں۔ اسی طرح اپنے ساتھ چھوٹے بچوں کو نہ رکھیں، یہ گندگی اور غلاظت پھیلاتے ہیں۔ دیواروں پر نعرے لکھتے ہیں اور مکانات کو گندہ کرتے ہیں اور آسانی اس میں رہے گی کہ خود باری باری کام کیا کریں اور ایک دن خدمت کیلئے مختص کر دیں۔ اسی طرح ان چھوٹوں سے خدمت نہ کرائیں بلکہ اپنی خدمت خود انجام دیں۔

قسط ۲

جناب مولانا محمد شہاب الدین ندوی صاحب
بنگلور (انڈیا)

سائنسی میدان میں مسلمانوں کا عروج وزوال اور اس کے اسباب واثرات اور تلافی مافات

موجودہ دور میں سائنس اور ٹیکنالوجی کی بے مثال ترقی نے پورے انسانی معاشرے کا احاطہ کرلیا ہے ۔ آج ہماری انفرادی واجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں رہ گیا ہے جو ان کے اثرات سے خالی ہو ۔ مختلف میدانوں میں صنعت وحرفت کی ترقی کے باعث پوری دنیا سکڑ کر ایک چھوٹے سے شہر کی طرح بن گئی ہے اور مختلف ممالک اس شہر کے محلوں کیطرح نظر آرہے ہیں ۔ چنانچہ پوری دنیا ٹیلی فون ، ٹیلی پرنٹر ، فیکس ،ریڈیو ، ٹی وی اور کمپیوٹر (انٹرنیٹ) وغیرہ کے ذریعہ اسطرح جڑی ہوئی ہے کہ ہم ایک چھوٹے سے کمرے میں بیٹھ کر پوری دنیا کی سیر کرسکتے ہیں اور آن کی آن میں کسی بھی ملک یا دنیا کے کسی بھی شہر سے رابطہ قائم کرسکتے ہیں ۔ گویا کہ سارا جہاں ہماری مٹھی میں ہے ۔

معاشرے پر زوال ملت کے اثرات :- مختلف سائنسی علوم کی ترقی کی بدولت آج دنیا میں ہزاروں لاکھوں صنعتیں کام کررہی ہیں اور موجودہ انسان برق وبھاپ ، شمسی توانائی اور جوہری طاقت کو مسخر کرکے سمندروں پر اپنی سیادت قائم کرچکا ہے ۔ زمینی خزانوں کا مالک بن چکا ہے ۔ اور فضاو خلا پر حکمرانی کررہا ہے ۔ گویا کہ وہ پوری کائنات پر قابض ہوچکا ہے ۔ انیسویں اور بیسویں صدی میں یورپ اور امریکہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں زبردست ترقی کرکے اقوام عالم پر چھاگئے اور ان علوم سے تہی مایہ قوموں کو اپنا غلام اور حاشیہ بردار بنالیا ۔ مشرقی اقوام اور خاص کر ملت اسلامیہ کی غفلت اور کوتاہی کے باعث عالم اسلام اس میدان میں پیچھے رہ گیا اور اس کے منفی اثرات ہمارے معاشرے اور خاص کر ہمارے نوجوانوں پر بھی پڑے ۔ اور ان میں بددلی اور قنوطیت نے جنم لیا ۔ بلکہ اس کے نتیجے میں دین ومذہب سے برگشتگی بھی عمل میں آئی ۔ کیونکہ آج دنیا کی تمام قومیں بشمول مسلمان

مغرب کی اس متاثرکن مادی ترقی کی وجہ سے مغربی فلسفوں اور اسکے طرز زندگی سے متاثر و مسحور ہوچکے ہیں اور اپنے دین و مذہب کو استخفاف کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ اس اعتبار سے یہ عالم اسلام کیلئے ایک سنگین مسئلہ اور موجودہ دور کا سب سے بڑا چیلنج ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ بطور علاج اسکے اسباب و محرکات کا جائزہ لے کر اس صورت حال کو بدلا جائے۔ جو آج اسلام جیسے دین ابدی پر اثرانداز ہورہا ہے۔ ورنہ مسلم معاشرہ اور خاص کر مسلم نوجوانوں کا اپنے دین وایمان پر اعتماد بحال نہ ہوسکے گا۔ بلکہ دین سے انکی دوری مزید بڑھتی جائے گی۔

سائنس کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ:- واقعہ یہ ہے کہ سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں مغربی ممالک کی پیش قدمی اچانک اور راتوں رات نہیں ہوگئی، بلکہ یہ ایک طویل تاریخی عمل کا نتیجہ ہے اور اس عمل میں دنیا کی مختلف قوموں اور خاص کر مسلمانوں کا سب سے بڑا حصہ ہے۔ چنانچہ تاریخی اعتبار سے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ قرون وسطیٰ میں اہل اسلام نے مختلف سائنسی میدانوں میں ترقی کرکے جدید علوم وفنون کی جو بنیادیں ڈالی تھیں انہیں بنیادوں پر مغربی قوموں نے اپنی عمارت کھڑی کی۔ ظہور اسلام سے پہلے یونانیوں، رومیوں، کلدانیوں، بابلیوں اور اہل ہند وغیرہ کا جو کچھ علمی سرمایہ تھا وہ محض ظن و تخمین اور نظریات ومفروضیات کا مجموعہ تھا۔ جب کہ اس کے برعکس اہل اسلام نے تجرباتی سائنس کی بنیاد ڈال کر مختلف علوم وفنون اور خاص کر حساب، الجبرا، جغرافیہ، طب، نباتیات، حیوانات، فلکیات، طبیعیات اور کیمیا وغیرہ (تمام سائنسی علوم) کو خوب ترقی دی۔ چنانچہ ان علوم میں مسلمانوں کے تقدم اور ان کی اولیت کے خود بہت سے مغربی فضلاء معترف ہیں، جیسا کہ تفصیل آگے آرہی ہے۔

قرآن عظیم کا تاریخی رول:- اور اس سلسلے میں دوسری حقیقت یہ ہے کہ سائنسی علوم کے میدان میں اہل اسلام کو آگے بڑھانے کا بنیادی محرک خود قرآن عظیم ہے۔ جس نے اپنے دینی وشرعی مقاصد کو بروئے کار لانے کیلئے اہل اسلام کو مظاہر کائنات میں غور وفکر اور ان کی جانچ پڑتال کرنے اور ان کے نظاموں کے اندر ودیعت شدہ اسباب وعلل کا پتہ لگانے کی مختلف اسالیب اور پرزور انداز میں دعوت دی تھی۔ چنانچہ بطور مثال چند آیات ملاحظہ ہوں: " قل انظروا ماذا فی السموٰت والارض " کہدو کہ ذرا غور سے دیکھو تو سہی کہ زمین اور آسمانوں (اجرام سماوی) میں کیا کیا چیزیں موجود ہیں۔ (یونس: ۱۰۱)

" قل یسروا فی الارض فانظروا کیف بدا الخلق ثم ینشی النشاۃ الآخرۃ "
کہدو کہ تم لوگ زمین میں چل پھر کر (اچھی طرح) مشاہدہ کرلو کہ (اخلاق عالم نے) مخلوق کو اولاً کس طرح پیدا کیا؟ پھر اللہ دوسری مرتبہ بھی اسی طرح پیدا کرے گا۔ (عنکبوت: ۲۰)

" افلا ینظرون الی الابل کیف خلقت۔ والی السماء کیف رفعت۔ والی الجبال کیف نصبت۔ والی الارض کیف سطحت۔ " کیا یہ لوگ اونٹوں کو نہیں دیکھتے کہ ان کی خلقت کس طرح (عجیب وغریب طور پر) بنائی گئی ہے؟ اور آسمان کس طرح اونچا اٹھایا گیا ہے؟ پہاڑ کس طرح (زمین میں مضبوطی کے ساتھ) دھنسائے گئے ہیں؟ اور زمین کس طرح (اپنی پوری گولائی میں) پھیلادی گئی ہے؟ (غاشیہ: ۱۷۔۲۰) " افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنیناھا وزیناھا وما لھا من فروج " تو کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر موجود آسمان کو غور سے نہیں دیکھا کہ ہم نے اسے کس طرح بنایا اور آراستہ ہے؟ چنانچہ اس میں کسی قسم کا شگاف نہیں ہے۔ (ق:۶) " ولقد جعلنا فی السماء بروجاً وزینھا للنظرین " ؛ اور ہم نے آسمان میں یقیناً (بہت سے) بروج (ستاروں کے جھومٹ اور کہکشائیں) بنادی ہیں۔ اور انہیں غور سے دیکھنے والوں کیلئے مزین کر دیا ہے۔ (حجر: ۱۶) " انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ " (پیڑ پودوں کے) پھل کو غور سے دیکھو جب وہ پھل لانے اور پکنے لگتا ہے۔ (انعام: ۹۹)

" فلینظر الانسان الی طعامہ " ، انسان کو چاہئیے کہ وہ اپنی غذا کا مشاہدہ کرے (کہ وہ مختلف طبیعی قوتوں کی کارفرمائی کے باعث کس طرح اس کے ہاتھوں تک پہنچتی ہے؟) (عبس: ۲۴)

" فلینظر الانسان مم خلق۔ خلق من ماء دافق " ، انسان کو نظر ڈالنا چاہیے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا ہے؟ وہ ایک اچھلتے پانی سے پیدا کیا گیا ہے۔ (طارق: ۵۔۶)۔ یہ اور اس قسم کی دیگر آیات سے یہ حقیقت پوری طرح روشنی میں آجاتی ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کو اس کائنات کی ایک ایک چیز اور ایک ایک مظہر فطرت کا دقت نظر سے جائزہ لینے اور ان کے نظاموں کی چھان بین کرنے کی تاکید کی ہے۔ اور یہ تو ظاہر ہے کہ تجرباتی سائنس کی اولین بنیاد رؤیت ومشاہدہ میں ہے، اور اس لحاظ سے قرآن عظیم روئے زمین پر تجرباتی سائنس کا اولین داعی وعلمبردار قرار پاتا ہے۔ اس موقع پر یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اوپر مذکور تمام آیات میں لفظ " نظر " مختلف حیثیتوں سے استعمال کیا گیا ہے اور اس کے معنی محض خالی خولی دیکھنے یا " ایک نظر " ڈال لینے کے نہیں، بلکہ ماہرین لغت اور ائمہ تفسیر کے تصریح

کے مطابق غور وفکر کرنے، نظر بصیرت ڈالنے اور کسی چیز کا جائزہ لینے کے ہیں۔

(قال الجوھری: "النظر تامل الشئی بالعین"۔ جوہری نے کہا ہے کہ نظر کے معنی آنکھ کے ذریعہ کسی چیز میں غور کرنا ہے (۱)۔ امام راغب اصفہانی تحریر کرتے ہیں

: قل انظروا ماذا فی السموت والارض، ای تاملوا"۔ یعنی انظروا کے معنی غور وفکر کرنے کے ہیں (۲)۔ اور علامہ زمخشری "انظروا الی ثمرہ اذا اثمروینعہ" (انعام ۹۹) کی تفسیر میں تحریر کرتے ہیں: نظر اعتبار واستبصار واستدلال۔ یعنی اس مظہر ربوبیت کو عبرت وبصیرت اور استدلال کی نظر سے دیکھو (۳)۔

قرآنی دعوت فکر اور دلائل ربوبیت :- اس موقع پر ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن حکیم نے نظام کائنات میں چھان بین کرکے اس کے اندر موجود حقائق یا اسباب وعلل کا پتہ لگانے کی تاکید کیوں کی ہے اور اس دعوت فکر کے مقاصد کیا ہیں؟ تو اس کے دو بنیادی مقاصد نظر آتے ہیں: پہلا مقصد یہ ہے کہ مظاہر فطرت کے منظم مطالعہ سے ان میں ودیعت شدہ خدائی دلائل (آیات الہیٰ) خود انسانی تحقیق کے ذریعہ منکشف ہوجائیں، تاکہ منکرین حق کو انکار خدا کی گنجائش باقی نہ رہ جائے، بلکہ ان پر مؤثر طریقے سے خدا کی حجت پوری ہوجائے۔ خدائی دلائل سے مراد خدا کی توحید، اس کی خلاقیت اور اس کے ربوبیت والوہیت کے وہ آثار (نشانیاں) ہیں جو اشیائے عالم میں غور وخوض اور تحقیق وتفتیش کے باعث ان کے منطقی نتائج کے طور پر سامنے آتے ہیں اور ان دلائل وبراہین کے ذریعہ شرک ومظاہر پرستی اور الحادولادینیت کے علاوہ ان تمام مادی فلسفوں کا ردوابطال ہوتا ہے جو آج عالم انسانی کو گھیرے ہوئے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں ارشاد ربانی ہے:

" ان فی خلق السموت والارض واختلاف الیل والنهار والفلک التی تجری فی البحر ینفع الناس وما انزل الله من السماء من ماء فاحیابه الارض بعد موتها وبث فیها من کل دابة وتصریف الریح والسحاب المسخربین السماء والارض لایت لقول یعقلون ": زمین اور آسمانوں کی خلقت وہئیت میں دن رات کے ادل بدل میں، ان جہازوں میں جو سمندر میں لوگوں کے لئے فائدہ مند چیزیں لے کر چلتے ہیں، اس پانی میں جسے اللہ نے آسمانی بلندی سے نازل کیا اور اس کے ذریعہ مردہ زمین کو زندہ کردیا اور اس میں ہر قسم کے جانور پھیلا دئے، ہواؤں کے ہیر پھیر میں اور اس بادل میں جو زمین اور آسمان کے

درمیان مسخر ہے (غرض ان تمام مظاہر میں) عقل مندوں کے لئے یقیناً (بہت سی) نشانیاں (دلائل ربوبیت) موجود ہیں۔ (بقرہ ۱۶۴)۔ یہ قرآن حکیم کی ایک اہم اور جامع ترین آیت ہے جس میں وجود باری اور اس کی توحید (وحدانیت) کے آٹھ دلائل مذکور ہیں (۴) اور دیگر مقامات میں ان کی تفصیل مذکور ہے اور اس قسم کی آیات سے مقصود خلاق عالم کی ربوبیت والوہیت کا اثبات مقصود ہے۔ جیسا کہ اوپر مذکور آیت کریمہ سے پہلی والی آیت کریمہ اس حقیقت پر روشنی ڈال رہی ہے: " والھم اله واحد لا الا ھو الرحمن الرحیم " اور تمھارا الہ (معبود) ایک ہی الہ ہے، اس کے سوا دوسرا کوئی الہ (اس پوری کائنات میں) موجود نہیں ہے وہ (اپنی مخلوق پر) بڑا مہربان ہے۔ (بقرہ ۱۶۳)

تسخیر اشیاء اور خدائی نعمتیں :- اور اس دعوت فکر کا دوسرا بنیادی مقصد تسخیر اشیاء ہے۔ یعنی مظاہر عالم میں غور و فکر اور ان کی جانچ پڑتال کے باعث مادی اشیاء میں ودیعت شدہ مادی فوائد یا " خدائی نعمتوں " سے مستفید ہوکر ایک حیثیت سے انسانی زندگی کو بہتر سے بہتر بنانا اور دوسری حیثیت سے دین الہیٰ کے مادی وسیاسی غلبے کے لئے فوجی وعسکری قوت وطاقت حاصل کرنا ہے جو مادی اشیاء کی " توڑپھوڑ " سے حاصل ہوتی ہے جیسے برق وبھاپ، جوہری توانائی، برقی مقناطیسی لہریں اور لیزر شعائیں وغیرہ، جن کے باعث آج انسان ٹیکنالوجی کے میدان میں زبردست کارنامے انجام دے رہا ہے اور یا پوری دنیا کو زیروبر کرکے اپنی سیادت جتا رہا ہے۔ مادی اشیاء کے اندر چھپے ہوئے یہ سارے فوائد دراصل وہ پوشیدہ نعمتیں ہیں جن کو قرآن حکیم میں " باطنی نعمتیں " کہا گیا ہے۔

" الم تروا ان اللہ سخرلکم مافی السموت ومافی الارض واتبع علیکم نعمة ظاہرة وباطنة " کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمھارے لئے رام کردیا ہے اور تم پر اپنی ظاہری اور باطنی تمام نعمتیں پوری کردی ہیں؟ (لقمان: ۲۰)۔

" وسخر لکم مافی السموت ومافی الارض جمعیاً منه، ان فی ذلک لقوم یتفکرون " اور اس نے اپنے فضل سے زمین اور آسمانوں کی تمام چیزوں کو تمھارے کام میں لگادیا ہے۔ یقیناً اس (مظہر ربوبیت) میں غور وفکر کرنے والوں کے لئے (کافی) نشانیاں موجود ہیں۔ (جاثیہ: ۱۳)

" وان تعدو نعمت اللہ لاتحصوھا " . اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا بھی چاہو تو نہ کرسکو گے۔ (ابراہیم: ۳۴)۔ چنانچہ ان مادی فوائد کو " خدائی نعمتیں " قرار دینے کا فلسفہ یہ ظاہر کرتا

ہے کہ یہ تمام فوائد انسانیت کے فائدے کے لئے استعمال کئے جائیں نہ کہ اسے نقصان پہنچانے کی غرض سے۔ لہذا اگر یہ مادی فوائد خدا پرست لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتے تو آج ضرور نوع انسانی ان فوائد سے مستفید ہوتی اور ان کے ضرر سے بچی رہتی۔ مگر موجودہ جنگ باز قوموں اور مادہ پرستوں نے ان اشیاء کے مضر پہلوؤں کا استعمال کرکے سارے جہاں کو ایک جہنم زار بنادیا ہے۔ یہ [illegible] کا ایک بہت بڑا نقصان ہے جو اہل اسلام کے اس میدان سے ہٹ جانے کے باعث پیدا ہوا ہے۔ غرض مقصد اول سے فکری اعتبار سے دین الہیٰ کا استحکام عمل میں آتا ہے اور مقصد ثانی سے انسانی زندگی کی بہتری عمل میں آتی ہے اور اس کے تمدن کا ارتقا ہوتا رہتا ہے۔ مگر اس باب میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ جو بھی قوم موجودات عالم میں غور وفکر کرکے ان کی تسخیر کرے گی وہ ان فوائد سے ضرور متمتع ہوگی۔ کیونکہ یہ مادی وتمدنی فوائد دراصل وہ انعامات الہیٰ ہیں جو مادی اشیاء میں غوروفکر کرکے نظام ربوبیت کی تنقیح وتوجیہہ کرنے یا خدائی "نشانیوں" (دلائل ربوبیت) کو اجاگر کرنے کے صلے میں عنایت کئے جاتے ہیں۔

اسلام کی جامعیت:- اس بحث سے بخوبی واضح ہوگیا کہ اسلام ترک دنیا کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ دین ودنیا کے ملاپ کا ایک کامل اور بے عیب تصور پیش کرتا ہے اور فطرت وشریعت یا مادیت اور روحانیت میں کامل توازن قائم کرتے ہوئے ایک حقیقت پسندانہ نقطہ نظر اپنانے پر زور دیتا ہے۔ چنانچہ جب تک اسلامی معاشرہ ان دونوں میدانوں میں افراط وتفریط کے بغیر کاربند رہا اس میں کسی قسم کا فکری انتشار پیدا نہ ہوا۔ جس طرح کہ آج دین و دنیا میں تفریق کے باعث اس قسم کا انتشار مسلم معاشروں میں نظر آرہا ہے۔ اور اسکے نتیجے میں ہمارے نوجوان مایوسی کا شکار ہوکر مغربی ملکوں کی "مادیت" میں پناہ لینے پر خود کو مجبور پارہے ہیں۔ کیونکہ کسی بھی معاشرہ کو مادیت سے الگ کرکے صرف روحانیت پر زور دینے کا نتیجہ وہی ہوسکتا ہے جو ماضی میں عیسائیت کے ساتھ پیش آیا اور وہ مادیت کے سامنے مکمل طور پر گھٹنے ٹیکنے پر مجبور ہوگئی اور یہی صورت حال آج مسلم معاشرہ کو بھی درپیش ہے۔ لہذا مسلم نوجوانوں کا دین وشریعت پر اعتماد بحال کرنے کیلئے اسلامی نظریات وتعلیمات کا مکمل نفاذ ضروری ہے۔ تاکہ وہ اپنے دین وشریعت پر مضبوطی کے ساتھ کاربند رہتے ہوئے تمدن واجتماع یا سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھیں اور دین وشریعت کے سائے میں تمدنی کارنامے انجام دے سکیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام صرف شرعی واخلاقی مسائل ہی کا مجموعہ

نہیں بلکہ وہ فکری ونظریاتی اور تمدنی واجتماعی مسائل میں بھی اہل اسلام کی مکمل رہنمائی کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

فطرت وشریعت میں تطبیق :- غرض اسلام کی جامع تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ قرون وسطیٰ میں ہمارے اسلاف نے دین ودنیا میں تفریق کئے بغیر دونوں میدانوں میں ترقی کرکے اقوام عالم کی کامیاب قیادت کی اور اپنے پیچھے علوم وفنون کا گرانمایہ سرمایہ چھوڑ گئے۔ چنانچہ ایک طرف مسلم فلسفہ اور سائنس داں تھے جو نظام کائنات میں غوروخوض کرکے نت نئے علمی حقائق دریافت کیا کرتے تھے تو دوسری طرف علمائے دین کا ایک خاص گروہ تھا جو فطرت وشریعت میں تطبیق دے کر دین وشریعت کی حقیقت واضح کرتا اور ان دونوں کے درمیان پیدا شدہ تناقض کو دور کرتا تھا۔ چنانچہ گروہ اول میں یعقوب بن اسحاق کندی، جابر بن حیان، محمد بن موسیٰ خوارزمی، ابونصر فارابی، محمد بن زکریا رازی، ابن ہیثم، بوعلی سینا، ابوریحان البیرونی، ابن نفیس اور ابوالقاسم الزہراوی وغیرہ نظر آتے ہیں تو دوسری طرف گروہ ثانی امام ابوالحسن اشعری، امام ابومنصور ماتریدی، امام الحرمین جوینی، امام غزالی، امام رازی، علامہ ابن رشد، علامہ قزوینی، امام ابن یتمیہ، امام ابن قیم، علامہ تفتازانی، قاضی عبدالرحمان ایجی اور علامہ شریف جرجانی وغیرہ بھی دکھائی دیتے ہیں، جنہوں نے اپنے وقت کے کلامی مسائل پر کام کرکے بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے جو اس راہ میں کام کرنے والوں کے لئے ایک نمونہ اور مثال ہے۔ چنانچہ اس سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ امام غزالی، امام رازی اور امام ابن یتمیہ کی خدمات کو کسی بھی طرح بھلایا نہیں جاسکتا۔

فطرت اور شریعت یا مادیت وروحانیت کے درمیان پیدا ہونے والے تناقض وتضاد کو دور کرنے کیلئے اس طرح کا عمل ہر دور میں ضروری ہے تاکہ اس کے نتیجے میں اہل اسلام اور خاص کر مسلم نوجوانوں کا یقین وایمان دین ابدی پر بحال ہو سکے اور اس کے نتیجے میں ان کے اندر اعتماد اور احساس برتری کے جذبات پیدا ہو سکیں۔ چنانچہ فطرت وشریعت کے درمیان تطبیق کے اس عمل کی وضاحت صحیفہ خداوندی میں اس طرح آئی ہے جو اہل ایمان کے لئے خوشی ومسرت اور ان کے ایمان میں اضافے کا باعث بن سکتی ہے اور اس کے نتیجے میں ان کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آسکتی۔ بلکہ استحکام پیدا ہوتا ہے۔

" خلق اللہ السموت والارض بالحق ان فی ذلک لایۃ للمؤمنین " اللہ نے زمین اور آسمانوں کو حقانیت (حکمت، مصلحت) کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ یقینا ان (مظاہر) میں اہل ایمان

کے لئے ایک بڑی نشانی موجود ہے۔ (عنکبوت : ۴۴)۔ " قل نزله روح القدس من ربك بالحق ليثبت الذين آمنو وهدى وبشرى للمسلمين " کہدو کہ اس (کتاب) کو تیرے رب کی طرف سے روح القدس نے حقانیت کے ساتھ اتارا ہے تاکہ وہ اہل ایمان کو ثابت قدم رکھ سکے اور فرمانبرداروں کے لئے ہدایت اور خوشخبری کا باعث بن سکے۔ (نحل : ۱۰۲) " ونزلنا عليك الكتب تبيانا لكل شيء وهدى ورحمة وبشرى للمسلمين " اور ہم نے تجھ پر وہ کتاب اتاری ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور وہ اہل اسلام کے لئے ہدایت، رحمت اور خوشخبری ہے۔ (نحل : ۸۹)

علمائے اسلام کی ایک کوتاہی :- اس اعتبار سے اسلام نے دین ودنیا کی جامعیت کا ایک کامیاب تصور پیش کرکے ادیان ومذاہب کی تاریخ میں ایک تاریخ ساز رول ادا کیا تو دوسری طرف اہل اسلام نے اپنے سنہرے ادوار میں ان دونوں پہلوؤں کو عملی دنیا میں برت کر ایک تاریخی کارنامہ انجام دیا اور اس کے نتیجے میں فطرت وشریعت میں کامل مطابقت کا ظہور ہوا۔ چنانچہ مسلم ادوار میں دین اور "علم" یا دین اور جدید انکشافات کے درمیان کش مکش کے وہ مناظر کبھی رونما نہیں ہوئے جیسا کہ اہل کلیسا (چرچ) اور اہل علم کے درمیان اس قسم کے افسوسناک مناظر ظاہر ہوئے اور اسکے نتیجے میں الحادولادینیت نے جنم لیا۔ مگر موجودہ دور میں علمائے اسلام کی اس باب میں کوتاہی کے باعث پھر وہی صورتحال پیدا ہوگئی ہے جو عیسائیت اور جدید انکشافات کے درمیان کش مکش کا بنی تھی اور موجودہ مسلم نوجوانوں کی علوم مغرب پر "ایمان" اور اسلام پر "بے یقینی" کی ایک بہت بڑی وجہ علمائے اسلام کا منفی رویہ بھی ہے جو جدید علوم سے لاتعلقی اور ان پر بےاعتباری کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر علمائے اسلام دین ابدی کی تائید اور اس کی کاملیت پر یقین کرتے ہوئے روشن فکری اور وسیع النظری کا مظاہرہ کرتے اور اسلاف کے نقش قدم پر چلتے ہوئے فطرت وشریعت میں تطبیق دے کر ان دونوں کے حدود وضوابط واضح کرتے تو اس سے جہاں ایک طرف مسلم حکومتوں کو سائنس اور ٹیکنالوجی کے میدان میں آگے بڑھنے میں مدد ملتی تو دوسری طرف مسلم نوجوانوں کی ذہن سازی بھی بخوبی ہوتی اور وہ دین سے برگشتہ ہوکر افکار مغرب کی وادیوں میں بھٹکتے نہ پھرتے۔ (جاری ہے)

حوالاجات

(۱) لسان العرب ابن منظور ۲۱۵/۵ دارصادر بیروت (۲) المفردات فی غریب القرآن، ص ۵۱۵ بیروت (۳) تفسیر کشاف ۳۰/۲ طہران (۴) دیکھئے تفسیر کبیر ۱۹۷/۴ دارالفکر بیروت ۱۹۹۳ء

جناب لیفٹیننٹ کرنل (ر) محمد اعظم صاحب

کوسووعالمی ضمیر کیلئے چیلنج اور عالم اسلام کی بے حسی کیلئے تازیانہ

یوگوسلاویہ ایک خود ساختہ ملک تھا جو روس کی سوویت ریپبلکس کے طرز پر پہلی جنگ عظیم کے چند سال بعد سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو اکٹھا کر کے کمیونزم کے نظریات کے تحت معرض وجود میں لایا گیا۔ اور روس کے خاتمے تک سلامت رہا۔ ۱۹۸۲ء میں جب روس کی ریاستیں علیحدہ ہو کر خود مختار مملکتیں بنیں تو اسی طرح یوگوسلاویہ کی چند ریاستوں مقدونیہ، مانٹی نیگرو، بوسنیا، کروشیا او کوسووو غیرہ نے بھی آزادی کا اعلان کر دیا۔ اور مرکزی حکومت جو کہ سربوں کے کنٹرول میں تھی سے آزادی حاصل کرنے کیلئے کوششیں شروع کر دیں۔ جبتک مارشل ٹیٹو زندہ رہا یوگوسلاویہ ایک وحدت کے طور پر قائم رہا۔ مگر اس کے بعد صورتحال تبدیل ہوتی گئی اور سربوں کے وہ پرانے تعصّبات جو مسلمانوں کے خلاف ترکوں کے بلقان کی ریاستوں کو فتح کرنے کے وقت سے چلے آرہے تھے اور تقریباً ہر زمانے میں سر اٹھاتے رہے تھے۔ روس کے خاتمے کے بعد ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ اسی طرح چیکوسلاویکیہ دو علیحدہ نسلی ریاستوں چیک اور سلاویک میں تقسیم ہو گیا۔ اس کے بعد پہلے مقدونیہ اور پھر کروشیا اور بعد میں بوسنیا نے اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ سرب قدامت پسند مسیحی ہیں۔ بوسنیا اور کوسووو والے مسلمان ہیں۔ کروشیا کے باشندے عیسائیوں کے کتھولک فرقے سے تعلق رکھتے ہیں۔ مقدونیہ میں مسلمان سرب اور بلغارین آباد ہیں اور یہ تینوں نسلی طور پر مختلف ہیں۔ سربوں نے سب سے پہلے گڑبڑ مقدونیہ میں شروع کی مگر ان کے مظالم کا نشانہ صرف مسلمان بنے۔ یورپی ممالک کی مداخلت کے باعث کچھ عرصہ بعد یہاں امن قائم ہو گیا۔ مقدونیہ کے بعد سربوں نے بوسنیا ہرزگووینا کے خلاف نسلی صفائی کا آپریشن شروع کیا۔ جہاں مسلمان ایک بہت بڑی اکثریت میں تھے۔ مقدونیہ، بوسنیا اور کروشیا میں سب سے زیادہ مظالم سربوں نے مسلمانوں پر ڈھائے۔ اب بوسنیا اور کروشیا کو اکٹھا کر کے فلسطین کے طرز پر محدود آزادیوں کی ایک ریاست مغربی ممالک نے قائم کر دی ہے جس سے اب وہاں قدرے امن ہے۔

ان ممالک سے فارغ ہو کر سربوں نے اپنی توجہ کوسوو کے مسلمانوں کی طرف مبذول کرنی شروع کی، جو نسلی طور پر البانوی مسلمان ہیں اور کوسوو کی آبادی کا ۹۰ فیصد ہیں۔ سربوں کو ترکوں کے ہاتھوں عبرتناک شکست ۱۳۸۹ء میں کوسوو ہی میں ہوئی تھی۔ جو پانچ سو سال کا عرصہ گزر جانے کے باوجود سرب آج تک نہیں بھلا سکے۔ کوسوو کو ریاستی خود مختاری ۱۹۷۴ء میں ٹیٹو کے زمانے میں دی گئی تھی جسے پندرہ سال بعد سربوں نے ختم کر دیا۔ اور ایک مربوط پروگرام کے تحت، مسلمانوں کا انخلا اور انکی نسل کشی شروع کر دی۔ اور کوشش یہ رہی کہ مسلمانوں کو دھکیل کر مقدونیہ اور البانیہ کی طرف مہاجر بنا کر بھیج دیا جائے تاکہ سربوں کیلئے یہ علاقے خالی ہو جائیں۔

کوسوو بیس لاکھ آبادی کا ایک چھوٹا سا ملک ہے جسکی تقریباً چار سے پانچ لاکھ آبادی گھروں سے نکل کر پہاڑوں، جنگلوں اور سڑکوں پر محفوظ مقامات کی تلاش میں سرگرداں ہے۔ پناہ گزینوں کے یہ قافلے البانیہ، مقدونیہ اور مانٹی نیگرو کی سرحدوں کی طرف رواں دواں ہیں۔ اور ان تینوں ہمسایہ ملکوں نے وسائل نہ ہونے کیوجہ سے ان پناہ گزینوں کیلئے اپنی سرحدیں بند کر دی ہیں اور یہ لوگ سرحدوں پر رُکے پڑے ہیں۔ مقدونیہ، ترکی اور کئی دوسرے یورپی ممالک نے کوسوو کے مہاجرین کیلئے چند ہزار لوگوں کو عارضی پناہ دینی منظور کر لی ہے۔ کوسوو کے دارالحکومت پرسٹینا میں تقریباً ایک لاکھ مسلمانوں کو سرب فوج نے گھیرے میں لیا ہوا ہے تاکہ ان کو نیٹو کے ہوائی حملوں کے خلاف انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کیا جا سکے۔

کوسوو میں مسلمانوں کے خلاف سربوں کے مظالم کو شروع ہوئے تقریباً ایک سال کا عرصہ ہو چکا ہے مگر یورپی کمیونٹی خاموش رہی۔ مسلمانوں کو ان کے گھروں سے نکالا جا رہا تھا مگر بنیادی انسانی حقوق کے علمبردار یہ سب کچھ دیکھتے رہے۔ جب یہ مظالم اپنی انتہا کو پہنچے اور بین الاقوامی میڈیا پر سربوں کی دل ہلا دینے والے مظالم کی داستانیں عام ہوئیں تو امریکہ کے ایماء پر نیٹو نے تین چار ہفتے پہلے سربوں کے ساتھ رابطے قائم کرنے شروع کیے اور انہیں کوسوو کے مسئلہ کو سیاسی طور پر حل کرنے کیلئے کہا، مگر یوگوسلاویہ کے سرب صدر سلوبودان ملاسووچ نے بہیمیت کا یہ کھیل جاری رکھا اور نیٹو کی کسی بات کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس طرح نیٹو کے ساتھ اس کے مذاکرات

اجلاس ناکام ہوتے رہے۔ جس کے نتیجے میں بالآخر نیٹو نے چند روز پہلے یوگوسلاویہ پر ہوائی حملے شروع کر دیے۔ جس کیلئے ملا سوچ پہلے سے ہی تیار تھا اور اپنی مکمل تیاری کیے ہوئے تھا۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ کوسووکے مسلمان امن کی تلاش میں گھر بار چھوڑ کر نکلتے جارہے ہیں۔ اس وقت تقریباً دس لاکھ لوگ گھروں کو چھوڑ کر جا چکے ہیں جس کا نصف کوسووسے باہر اور تقریباً اتنی تعداد ملک کے اندر پناہ گزین ہو چکی ہے۔ سرب فوجیں کوسوو میں ہزاروں کی تعداد (ایک اندازے کے مطابق چالیس ہزار) میں موجود ہیں۔ جو ان کو سنگیوں کے نوک پر گھروں سے نکال رہی ہیں۔ یوگوسلاویہ پر ہوائی حملوں کا کوسوو میں پھیلی ہوئی سرب فوجوں پر کوئی اثر نہیں ہو رہا ہے اور وہ بدستور جور و ظلم میں مصروف ہیں۔ اور مسلمانوں کی نسل کشی جاری ہے۔

نیٹو کی افواج جن کا مکمل کنٹرول امریکہ کے ہاتھ میں ہے۔ مغربی یورپ کے ان ممالک پر مشتمل ہے جو اس کے ممبر ہیں۔ اس میں برطانیہ، فرانس، جرمنی، اٹلی وغیرہ کے علاوہ یورپ کے دوسرے چھوٹے ملک شامل ہیں۔ نیٹو یورپ میں روس کے اثر و رسوخ کو روکنے کیلئے بنایا گیا تھا۔ اس کو بنے ہوئے پچاس سال ہو گئے ہیں۔ مگر اس کے استعمال کا موقع پہلی بار اب یوگوسلاویہ میں میسر آسکا ہے۔ نیٹو کے مقابلے میں روس نے بھی اپنا ایک علیحدہ بلاک بنا رکھا تھا جو کہ مشرقی یورپ کے روس کے زیر اثر ممالک پر مشتمل تھا مگر اب وہ ختم ہو چکا ہے۔ روس کے خاتمے کے بعد نیٹو کی ضرورت باقی نہیں رہی تھی مگر یورپ پر اپنی اجارہ داری قائم رکھنے کیلئے امریکہ نے نیٹو کو ختم نہیں کیا۔ روس سیاسی اور اقتصادی طور پر تباہی کے دہانے پر پہنچ چکا ہے۔ اور اسکی اہمیت صرف سیکورٹی کونسل کی مستقل رکنیت تک محدود ہے۔ مگر وہ ابھی تک عالمی طاقت ہونے کا دعویدار ہے اور پرانے زعم سے باہر نہیں آسکا اور اپنے پرانے ساتھیوں بھارت، یوگوسلاویہ وغیرہ کے معاملات میں اپنی اہمیت کا اظہار مختلف طریقوں سے کرتا رہتا ہے۔

امریکہ عالم اسلام کا دوست یا خیر خواہ نہیں بلکہ اس کو عالمی معاملات میں ہمیشہ اپنا مفاد پیش نظر رہتا ہے۔ کوسوو میں امریکہ کی دلچسپی کی وجوہات کا اندازہ درج ذیل باتوں سے کیا جاسکتا ہے :

الف۔ یورپ میں اپنی بالادستی قائم رکھنے کی شدید خواہش۔

ب۔ روس کے زیر اثر ملکوں کو یہ پیغام دینا کہ روس اب عالمی طاقت نہیں بلکہ امریکہ ہے۔
ج۔ دنیا پر ظاہر کرنا کہ بنیادی انسانی حقوق کا عالمی چمپئن امریکہ ہے۔
د۔ دنیا کو دکھانے کیلئے اپنی بہتر ٹیکنالوجی کا مظاہرہ۔
ہ۔ عالم اسلام کی ہمدردیاں حاصل کرنے کی کوشش۔

زمینی حالات سے جیسے کہ نظر آرہا ہے جب تک امریکہ اپنی گراؤنڈ فورسز سربوں کے خلاف استعمال نہیں کرتا کوسوو کے مسلمانوں کو بچانے کی اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ یہ بات چند امریکن سینٹروں نے بھی کھل کر کانگرس میں کہی ہے اور کئی اور لوگ بھی کہہ رہے ہیں۔ ویٹنام اور صومالیہ کے تلخ تجربات کے بعد امریکہ اس قدر خوفزدہ ہے کہ وہ اپنے عوام کے ڈر کیوجہ سے امریکن فوجی کہیں بھیجنے کیلئے تیار نہیں۔ خلیج کی جنگ میں عراق کے خلاف امریکن فوجیں بھیجنا صرف تزویراتی منصوبے کا حصہ تھا اور ان فوجوں کو استعمال نہیں کیا گیا۔ موجودہ حالات میں کوسوو میں اگر نیٹو کی زمینی افواج بوجوہ امریکہ بھیجنے کیلئے تیار نہیں تو عالم اسلام کو اس پر غور کرنا ہوگا۔ کہ کوسوو کے بے بس مسلمانوں کو کیسے بچایا جائے۔ اگر اس میں تاخیر کی گئی تو بہت جلد کوسوو مسلمانوں سے خالی ہو جائے گا۔ جو پناہ گزین بن کر جا چکے ہیں وہ تو شاید در در کی ٹھوکریں کھانے کے بعد کہیں جا بسیں گے مگر وہ جو سربوں کے گھیرے میں ہیں وہ شاید ہی زندہ رہیں ان چودہ پندرہ لاکھ مسلمانوں کے ساتھ کیا ہوگا یہ وقت ہی بتائے گا۔

کوسوو سے متعلق مسلم ممالک کی بے حسی باعث شرم ہے۔ ایران بطور چیئرمین او آئی سی خاموش تماشائی کے طور پر یہ سب کچھ دیکھتا رہا ہے۔ گو بوسنیا کے معاملہ میں اس نے کھل کر بوسنیا کے مسلمانوں کی مدد کی تھی مگر صدر خاتمی شاید روس کو ناراض نہیں کرنا چاہتے اس لئے چپ سادھے ہوئے ہیں۔ پاکستان کا کردار بہر طور غنیمت ہے کہ اس نے کچھ سامان بھیج کر اور او آئی سی کا اجلاس جو ۷۔ اپریل ۹۹ء کو جینوا میں ہو رہا ہے۔ بلا کر عالم اسلام کے ضمیر کو جنجھوڑا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جناب پروفیسر عبدالجلیل بھٹی صاحب
شعبہ تاریخ و مطالعہ پاکستان، اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور

سر سید اور شبلی کے نظریات کا موازنہ

جب مسلمانوں کو ہندوستان میں زوال کا سامنا کرنا پڑا، تو جہاں اس کے ان پر کئی قسم کے منفی نتائج واثرات مرتب ہوئے (ٹائن بی اسے Challenges کا نام دیتا ہے) وہاں اس کا یہ بھی فائدہ ہوا کہ مسلمانوں نے خواب غفلت سے بیدار (Response) ہونے کی سعی کی۔ اس کے نتیجے میں ہندوستانی مسلمانوں کو ایسے لوگوں کی جماعت (Creative Minority)(۱) میسر آئی کہ جس نے اپنے اپنے طور پر مسلمانوں کو قعر مذلت سے نکالنے کی کوشش کی۔ اس ضمن میں سر سید کا نام ایک سرخیل کے طور پر لیا جاتا ہے جو اپنی ذات میں خود انجمن تھے۔ ان کی تحریک علی گڑھ اپنے اندر کئی قسم کے مقاصد سموئے ہوئے تھی اور اس کے مقاصد کے حصول کیلئے جن لوگوں نے سعی کوشش کی ان میں اسکے حواس خمسہ یعنی سر سید اور دیگر چار افراد حالی، آزاد، شبلی اور نذیر احمد شامل ہیں۔ سر سید کے کام کے طریق کار اور انکے نظریات کے اعتبار سے عام طور پر ان کے رفقائے کار کے درمیان خاص ہم آہنگی موجود تھی لیکن انکی قریبی جماعت میں سے جس شخص کے ساتھ ان کا بعض شعبوں میں ھم آہنگی کے ساتھ ساتھ نظریاتی اور عملی بُعد بھی محسوس کیا جاسکتا ہے وہ شبلی نعمانی تھے۔ کیا مذہبی، سیاسی، کیا معاشرتی و تہذیبی اور کیا تاریخ کے نظریات کے بارے میں سر سید اور شبلی کے مزاج اور نظریات میں خاصا فرق موجود تھا؟۔ شبلی اور سر سید دونوں ھندوستانی مسلمانوں کے زوال پر ایک زبردست بند باندھنا چاہتے تھے اور اس کا رخ عروج کی جانب موڑ دینا چاہتے تھے مگر اس سلسلے میں بھی شبلی کا طریق کار سر سید کے طریق کار سے مختلف تھا۔ بقول باربرا مٹکاف :

" Unlike Sayyed Ahmed, shibli felt Muslim interests best seved by serieus cultivation of Islamic Learning, not western Learning" (2) اس طرح شبلی اسلام کے ماضی اور اسلامی اسلاف کے کردار و عمل اور زریں کارناموں کے ذریعے اپنے مقاصد کے

حصول کی جانب بڑھے۔ وہ گویا اس شعر کے حقیقی ترجمان بن کر ابھرے کہ جس میں کہا گیا ہے کہ

؎ جنہیں حقیر سمجھ کر بجھا دیا تو نے   وہی چراغ جلیں گے تو روشنی ہو گی

سرسید نے ہندوستانی مسلمانوں کے لئے جس لائحہ عمل کو اپنایا اسکی بنیادیں سیاست، معیشت اور مغربی علوم کے حصول پر مبنی تھی لیکن شبلی کی تاریخ نویسی کی تمام تر بنیادیں مذہب پر استوار تھیں۔ وہ تمام دیگر معاملات کو مذھب کا تابع محسوس کرتے تھے اس بناء پر وہ مذہب اسلام کی عملی تعبیر و تفسیر یعنی تاریخ اسلام کی جانب رجوع کرنے پر مصر تھے۔

ع دوڑ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو۔ سرسید سے اپنے مختلف طریق کار اور لائحہ عمل کے حوالے سے شبلی لکھتے ہیں کہ "زمانہ جانتا ہے کہ مجھ کو سرسید کے مذہبی مسائل سے سخت اختلاف تھا اور میں انکے بہت سے عقائد و خیالات کو بالکل غلط سمجھتا تھا" (۳) مہر افروز، شبلی کے سرسید سے اختلافی رویے کو "Harsh Attack" کا نام دیتی ہیں۔ (۴) قدوسی اسکی بنیادی وجوہ کا جائزہ لیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "شبلی کا درجہ عقل پسندی کی تحریک میں وہی ہے جو معتزلہ اور متکلمین میں امام ابوالحسن الاشعری کا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید، امام غزالی سے دور رہ کر مغرب کی تحریکوں سے قریب ہونے لگے تھے جبکہ شبلی، غزالی کے مؤقف سے الگ ہو کر امام ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے مطمع نظر کی طرف مائل ہو گئے۔ شبلی کے افکار بڑی حد تک ان دونوں ہی بزرگوں کا عکس خیال ہیں"۔ (۵)۔ حقیقت یہ ہے کہ سرسید اور شبلی دونوں اپنے ابتدائی دور میں غزالی جیسے اسلامی مفکر کے عقیدہ کے ہمنوا تھے یعنی وہ عام نوعیت کے اسلامی عقائد کے پیروکار رہے لیکن بعد میں سرسید نے غزالی کو خیرباد کہہ کر مغرب کی جانب رجوع کیا اور ان کے جدید نظریات اپنا لئے، لیکن شبلی نے غزالی کو چھوڑ کر غزالی دور اں یعنی امام ابن تیمیہ کی جانب رجوع کیا یعنی وہ اسلامی عقائد کے اعتبار سے غزالی سے بھی ایک قدم آگے بڑھ گئے اور عام عقائد کی بجائے شریعت (قرآن وحدیث) کا پختہ دامن اپنے ہاتھوں میں تھام لیا اور اسلامی تاریخ میں اس کا عکس تلاش کرنے کی سعی کی۔

شبلی نے اپنے مذہبی نظریہ کی اپنی تاریخ نویسی میں مختلف مواقع پر وضاحت کی ہے اس کے مطابق وہ مذہب کی اہمیت وافادیت کو مسلمانوں کے مستقبل اور ان کے عروج کے لئے ایک

ضروری اور بنیادی اکائی تصور کرتے ہیں۔ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ "مسلمان اگر مذہبی اثر سے آزاد ہو کر ترقی کریں تو ایسی ترقی سے تنزلی ہزار درجہ بہتر ہے" (٦)۔ مذہبی تعلیم کی اہمیت کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "میرا ہمیشہ سے خیال ہے اور میں نہایت مضبوطی سے اس پر قائم ہوں کہ مسلمان مغربی علوم میں گو ترقی کے کسی رتبے تک پہنچ جائیں لیکن جب تک ان میں مشرقی (مذہبی) تعلیم کا اثر نہ ہو، انکی ترقی مسلمانوں کی ترقی نہیں کہی جا سکتی۔ جس تعلیم میں روحانیت کا مطلق اثر نہ ہو وہ مسلمانوں کے مذہب، قومیت، تاریخ کسی چیز کو بھی زندہ نہیں رکھ سکتی (٧)۔ اپنے خیالات کی مزید وضاحت کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں انہوں نے لکھا کہ "مسلمانوں کو عربی تعلیم اور مذہبی تعلیم کی ضرورت ہے اور یہ ضرورت اس وقت تک باقی رہے گی جبتک مسلمانوں کی قوم کا باقی رہنا ضرور ہے" (٨)۔ مذہبی تعلیم کے معاشرتی اثرات کا کچھ یوں جائزہ لیتے ہیں: "مذہبی تعلیم کے بغیر اخلاق اور تربیت کا شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا" (٩)۔ اس طرح مذہب ہی بالادست قوت ہے نہ کہ سیاست (١٠) اور فلسفہ بھی مذہب کے تابع ہے۔ ان کے خیال میں فلسفیانہ غلطیوں کی بڑی وجہ مذہبی نظریات سے روگردانی تھی (١١)۔ الغرض سر سید کے برعکس شبلی نہ صرف مذہب کے بارے میں واضح نظریہ رکھتے تھے اور اسے ہر چیز پر قابل ترجیح سمجھتے تھے بلکہ ان کے نظریہ تاریخ اور تاریخ نویسی کی تمام تر بنیاد بھی مذہب پر قائم تھی۔ اسی وجہ سے انہیں ایک مابعد الطبیعاتی مورخ (Metaphysical Historian) کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ شبلی کی اسلامی یعنی مابعد الطبعیاتی تاریخ نویسی کے حوالے سے یہ بحث بھی خالی از دلچسپی نہیں کہ وہ عام مذہبی عقیدہ و مسلک کے حوالے سے کس قسم کے نظریات کے ہمنوا تھے اور ان کی تاریخ نویسی کا اس سے کیا تعلق رہا نیز اس سے ان کی تاریخ نویسی پر کس حد تک اثرات مرتب ہوئے؟ اس حوالے سے شبلی کا خود اپنے بارے میں یہ کہنا ہے کہ "میرے عقائد وہی ہیں جو حضرات حنفیہؒ کے عقائد ہیں۔ میں عقائد اسلام اور مسائل فقہ دونوں میں حنفی ہوں" (١٢)۔ اس میں بھی وہ اھل سنت کی شاخ، ماتریدیہ کے پیرو تھے (١٣) یہ بات تو عیاں ہے کہ شبلی راسخ العقیدہ مسلمان تھے اور وہ اپنی عملی زندگی میں عام قسم کی شرک وبدعات کے خلاف تھے۔ وہ قبر پرستی (١٤) شعبان و محرم کی بدعات (١٥) اور عبادت کے

زعم میں ناچنے، گانے کو ہرگز پسند نہیں کرتے تھے (۱۶)۔

اردو ھندی تنازع کے بعد سرسید نے متعصب ہندوؤں کے بارے میں ایک خاص رائے قائم کرلی اور گویا اپنا دو قومی نظریہ (Two Nation Theory) بھی پیش کردیا۔ اس طرح جب ۱۸۸۵ء میں ھندوؤں نے اپنی نمائندہ سیاسی جماعت آل انڈیا کانگرس قائم کی تو سرسید نے یہاں پر بھی مسلمانوں کے لئے نہایت دوررس اور مفید فیصلہ صادر کیا۔ سرسید نے مسلمانوں کو نہ صرف کانگرس سے دور رہنے کا مشورہ اور سبق دیا بلکہ کہا کہ ابھی وقت نہیں آیا کہ وہ سیاست میں حصہ لیں۔ انہوں نے مسلمانوں کو ماضی قریب کے تجربات اور ہمعصر دور کے ماحول اور چیلنجز کی بناء پر کہا کہ

"Your field is education and not politics" (18)

لیکن شبلی یہاں پر بھی سرسید سے اپنے مذہبی اختلافات کی طرح اپنے سیاسی اختلافات کا بھی نہایت شدومد کے ساتھ اظہار کرتے ہیں۔ انہوں نے اس ضمن میں جو دلائل و قرائن اور شہادتیں پیش کی ہیں وہ بھی خاصی وزنی محسوس ہوتی ہیں۔ اس حوالے سے شبلی کی نیت و فکر پر بھی شک نہیں کیا جاسکتا۔ مثلاً ایک مقام پر سرسید اور ان کے سیاسی نظریات کے ہمنواؤں پر کچھ یوں تنقید کرتے ہیں کہ :"ہم نیشنل کانگرس میں شریک ہو جائیں گے تو ہماری ہستی اس طرح برباد ہو جائیگی جس طرح معمولی دریا سمندر میں مل جاتے ہیں۔ اگر پارسیوں کی قوم ایک لاکھ کی جماعت کے ساتھ ہندوؤں کے ۱۹ کروڑ اور مسلمانوں کے ۵ کروڑ افراد کے مقابلہ میں اپنی ہستی قائم رکھ سکتی ہے اگر دادابھائی نوروجی تمام ہندوستان کے مقابلہ میں سب سے بڑے پہلے پارلیمنٹ کے ممبر ہوسکتے ہیں اگر گوکھلے تنہا اصلاحی منصوبوں کی عظیم الشان تحریک کی بنیاد ڈال سکتا ہے تو ۵ کروڑ مسلمانوں کو اپنی ہستی کے مٹ جانے کا اندیشہ نہیں کرنا چاہئیے...... ہماری سیاست جس کی آواز کلمہ شہادت کی طرح ولادت کے دن سے ہمارے کانوں میں پڑی صرف یہ تھی ابھی وقت نہیں آیا ہے ابھی ہمیں سیاست کے قابل بننا چاہئیے۔ ابھی صرف تعلیم کی ضرورت ہے۔ ہماری تعداد کم ہے اس لئے نیابتی اصول سلطنت ہمارے موافق نہیں۔ یہ الفاظ اس قدر دھرائے گئے کہ قوم کی رگ و پے میں سرایت کرگئے۔ ہر مسلمان بچہ ان خیالات کو ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے اور زندگی کے تمام مراحل میں

ساتھ رکھتا ہے۔ مسلمانوں کی عام جماعت میں جب سیاست کا نام آتا ہے تو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اچھے سے اچھا نوجوان تعلیم یافتہ گراموفون کی طرح ان الفاظ کو دھراتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جدو جہد سعی کوشش، حوصلہ مندی، قوت عمل، سرگرمی، جوش اور ایثار نفس کے لحاظ سے عام سناٹا چھا گیا...... ہم کو معلوم ہے کہ پونا میں سرونٹس آف انڈیا سوسائٹی قائم ہے جہاں اس وقت ۲۹ بی اے سیاست کی تعلیم پا رہے ہیں جو پانچ برس کی تعلیم کے بعد تمام عمر ہندوستان کی خدمت کریں گے...... لیکن یہ تمام عبرت انگیز آوازیں یہ تمام پرجوش نمونے، یہ تمام حیرت انگیز واقعات ہمارے دلوں میں ایک ذرا جنبش نہیں پیدا کر سکتے۔ ہماری قومی درس گاہوں نے آج تک ایثار نفس کی ایک مثال بھی نہیں پیدا کی صرف اس لئے کہ ہمارا پولٹیکل احساس بالکل مر گیا ہے"(۱۹)۔

شبلی یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ سرسید کے بعض سیاسی نظریات وافعال انگریزوں کے زیر تابع تھے اور یہ انکی انگریز نواز پالیسی کا ایک بڑا حصہ بن گئے تھے۔ مثلاً ایک مقام پر انکی سیاسی بلاغت آمد و آورد کے عنوان سے کچھ یوں گویا ہوتے ہیں :

کوئی پوچھے تو میں کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات — روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی
ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف — ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی (۲۰)

شبلی آل انڈیا مسلم لیگ کی پیدائش اور اسکے بچپنے کی عادات واطوار اور رنگ ڈھنگ یعنی اسکے منشور وایجنڈے کو انتہائی حقارت کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسکی وجوہات کے بارے میں لکھا ہے کہ "مسلم لیگ جب قائم ہوئی تھی تو اس کا مقصد گورنمنٹ کے بجائے ہم وطنوں سے لڑنا اور حکومت وقت سے اظہار وفاداری کرنا تھا، اس لئے اس وقت اسکے ارکان اور عہدیداروں میں زیادہ تر وہ لوگ تھے جو خطاب یافتہ امراء اور ارباب جاہ تھے"(۲۱)۔ شبلی نے مسلم لیگ کے اسی رویے پر سخت چوٹ لگائی اور اپنا یہ نعرہ بلند کیا کہ "قال کی بجائے حال درکار ہے"۔

لیگ والوں سے کہا میں نے کہ باتیں کب تک — یہ تو کہئے کہ عمل کی بھی بناء ڈالی ہے
ایک صاحب نے کہا آپ نہ گھبرائیں ابھی — حال بھی آئے گا اب تک تو یہ قوالی ہے (۲۲)

شبلی کے شاگردوں اور ہمعصروں میں سے کئی ایک ایسے زعماء بھی گزرے ہیں کہ جنہیں کئی طرح

سے شبلی کے نظریات نے متاثر کیا ان میں ابوالکلام آزادؒ، علامہ اقبالؒ، سید سلیمان ندویؒ اور مولانا جوہرؒ جیسے لوگ شامل ہیں۔ آزادؒ تو شبلی کی شاہراہ پر من وعن گامزن رہے، حالانکہ خود شبلی اگر زندہ رہتے اور ۱۹۱۴ء میں ان کا انتقال نہ ہوجاتا تو وہ ہمعصر اور مستقبل کے حالات وواقعات کو پرکھتے ہوئے اجتہاد کرتے اور انکے سیاسی نظریات میں تبدیلی پیدا ہوجاتی جیسا کہ جوہر، شوکت علی، جناح اور اقبال جیسے زعماء کے نظریات میں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔

سر سید اور شبلی کے مذہبی، تہذیبی، معاشرتی، ثقافتی اور سیاسی نظریات میں کس طرح کا اور کس حد تک فرق وبُعد موجود تھا، اس کا اندازہ متذکرہ بالا بحث سے ہوجاتا ہے۔ اسکے علاوہ تاریخ کے نظریات کے بارے میں بھی ان کے درمیان کسی قدر اختلاف محسوس کیا جاسکتا ہے مثلاً ماضی، حال اور مستقبل، تاریخ کی بنیادی اکائیاں ہیں اور یہ تینوں زمانے ہی اصل میں تاریخ ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں ہر دور کے مصنفین نے اپنی خاص نظروں سے دیکھا ہے۔ اس میں کسی نے کسی ایک زمانے کو ترجیح دی ہے تو کسی نے کسی دوسرے زمانے کو۔ اس سلسلے میں کسی نے تو ماضی کو اہمیت دی ہے تو کسی نے مستقبل کو اور کسی نے ماضی وحال یا حال و مستقبل کو یا تینوں زمانوں ماضی، حال اور مستقبل کو۔ بہر حال یہ تاریخ کا اہم اور دلچسپ موضوع رہا ہے اس لئے بھی کہ تاریخ کے نظریات اور تاریخ نویسی میں اسکی خاصی اہمیت رہی ہے۔ اصل میں "زمان" کے اعتبار سے وقت کی تقسیم، انسان نے تاریخی حقائق وواقعات کے تناظر کو سمجھنے کی غرض سے کی ہے تاکہ ان کے واقع ہونے کا صحیح وقت متعین کیا جاسکے۔ اسی تعین وقت کا نام تاریخ (History) تاریخ (Date) یا زمانہ اور عہد (Period, era, epoch) ہے۔ جہاں تک شبلی کا تعلق ہے وہ ماضی حال اور مستقبل پر بھرپور یقین رکھتے تھے اس وجہ سے وہ اپنی تاریخ نویسی میں ماضی کی عظیم تر بنیادوں پر حال اور مستقبل کی تعمیر کرنے کی سعی کرتے تھے۔ شبلی کی تاریخ نویسی کا زیادہ تر رجحان حال سے ماضی کی جانب ہے جیسا کہ اس شعر میں حال کو ماضی سے جوڑتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ

اس حال میں بھی روش وہی ہے ۔۔۔ دن ڈھل بھی گیا طپش وہی ہے (۲۳)

تاریخ میں یہ نظریہ تولید (یعنی حال، ماضی کے بطن سے پیدا ہوجاتا ہے) کے نام سے مشہور ہے۔

اس نظریہ کے حامی ماضی کو مثال کے طور پر پیش کرتے ہیں اور اپنی قومی زندگی سنہری دور سے تعبیر کر کے اس روایت پر زور دیتے ہیں کہ اگلے زمانے والے ہم سے بلند درجہ کے انسان تھے۔ شبلی کے نزدیک بھی ماضی کی اہمیت تھی۔ اس لئے بھی کہ ایک اسلامی مورخ ہونے کے ناطے انکی تاریخ نویسی کا فطری تقاضا بھی یہی تھا اس وجہ سے انہوں نے ماضی کے اسلامی هیروز کو اپنا موضوع بنایا تھا۔ اس ضمن میں ان کا یہ کہنا ہے کہ "دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ وہ پیچھے ہٹتے جائیں، پیچھے ہٹتے جائیں یہاں تک کہ صحابہ کی صف میں جاکر مل جائیں" (۲۴)۔ تاریخ کے اصول مراجعت (Theory of Regression) کے تحت نہ صرف حال، ماضی کا نتیجہ ہے بلکہ تاریخ کا ہر دور اپنے دور ماقبل کی پیداوار ہے اور ایک واقعہ دوسرے واقعہ کے ساتھ جڑا ہوا ہے اس طرح تاریخ مکمل طور پر ایک وحدت و تعلق کا نام ہے یعنی دنیا کے ایک تمدن کا دوسرے تمدنوں کے ساتھ واسطہ اور اشتراک عمل سامنے آتا ہے شبلی کے مطابق: "تمدن کے زمانے میں جو علوم و فنون پیدا ہوتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہوتے ہیں جن کا ہیولیٰ پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ تمدن کے زمانے میں وہ ایک موزوں قالب اختیار کر لیتا ہے اور پھر ایک خاص نام یا لقب سے مشہور ہو جاتا ہے" (۲۵)۔ ھیگل بھی حال کی تمام ترترقیوں کو ماضی کے اسباب وافکار کا نتیجہ قرار دیتے ہیں (۲۶) لیکن دوسری جانب ایک ایسا مکتب فکر بھی سامنے آتا ہے کہ جو ماضی کو ایک خطرناک آلہ اور دور وحشت سے تعبیر کرتا ہے۔ یہ دو طرح سے ممکن ہوا (الف) جدید دور میں تاریخ کو نئے سرے سے پرکھنے اور اس کے مختلف نظریات کی نئی ترتیب و تشکیل کے نتیجہ میں جیسا کہ مبارک علی لکھتے ہیں۔ "روشن خیالی کے دور میں تاریخ کو سائنسی اور عقلی بنیادوں پر پرکھا گیا لیکن اس فکر کے تحت ماضی کو دور حقیقت سمجھا گیا (۲۷)۔ (ب) خاص اغراض و مقاصد کے تحت ماضی کو اپنے لئے بے فائدہ بلکہ خطرناک سمجھنے کی وجہ سے جیسے سرسید نے ماضی سے اپنا دامن بچانے کی حتی الوسع کوشش کی۔ ان کا نظریہ ماضی گویا اس شعر کی تعبیر تھا کہ

؎ یاد ماضی عذاب ہے یارب چھین لے مجھ سے حافظہ میرا

کئی ایک مصنفین نے سرسید اور شبلی کے نظریہ ماضی میں فرق کی کئی ایک نظری اور عملی حوالوں

سے وضاحت کی ہے۔ فاضل مشہدی کے بقول "سرسید کا مؤقف یہ تھا کہ ماضی سے آنکھیں بند کر کے ترقی کرو اور مستقبل کی جانب بڑھو۔ اسکے برعکس شبلی مستقبل کی تصویر ماضی کے آئینے میں دیکھتے تھے اور ان روایات کو زندہ کرنا چاہتے تھے جو کبھی قوم کی سربلندی کا سبب بنی تھیں" (۲۸)
شبلی کے ذھنی، فکری میلانات، تاریخ نویسی اور دیگر عملی اقدامات بھی ان کے مربوط اور مکمل زمانی کیفیات کا پتہ دیتے ہیں مثلاً ان کا "الندوہ کا نصاب تعلیم اور دارالمصنفین کا تعلیمی پروگرام سرسید کے پروگرام سے مختلف تھا جو حال اور مستقبل کے ساتھ کے ماضی سے لگاؤ کا پتہ دیتے ہیں اور قدیم و جدید نصاب کی تدریس اسی حکمت عملی، سمجھوتے، مصلحت اور خاص فکری سطح کی دین تھا" (۲۹)
المختصر شبلی ایک متوازن معتدل اور حقیقت پسند مؤرخ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے ماضی، حال اور مستقبل کو تاریخ میں ان کی خصوصیات اور اہمیت کے پیش نظر علیحدہ علیحدہ مقام دیا۔ کسی کو کم تو کسی کو زیادہ۔ ان کے نزدیک مستقبل، ماضی و حال کا نتیجہ تھا اور اس کا درجہ آخری ضرور تھا لیکن شبلی ماضی و حال کی عمارت اصل میں اسی کی خاطر قائم کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ جمیل جالبی کا کہنا ہے کہ "شبلی نے اس دور میں وہ کام کیا جو ان کے علاوہ کسی اور نے نہیں کیا۔ انہوں نے قدیم علوم سے مسلمانوں کی دوبارہ دلچسپی پیدا کی۔ مسلمانوں کی تاریخ کو عہد حاضر کے تقاضوں کے مطابق دوبارہ لکھا تاکہ بدلے ہوئے حالات میں مسلمان اس تاریخ کو دوبارہ دلچسپی سے پڑھ سکیں" (۳۰) اس طرح زمان کی بحث میں شبلی کے مقام کا تعین کرتے ہوئے عبدالقیوم لکھتے ہیں: "کارلائل کی نسبت اس کے نقادوں کا خیال ہے کہ وہ پوری خصوصیت کے ساتھ ماضی کو حال کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے اردو زبان میں اس صفت میں شبلی کا مدمقابل مشکل سے نظر آئیگا" (۳۱)۔ اس سے ثابت ہوا کہ شبلی تاریخ نویسی کے وسیع تر نظریہ کے حامی تھے اور وہ زمانے کی تینوں کیفیات کے بارے میں اپنی تاریخ نویسی کو جامع ترین عنصر کے طور پر متعارف کراتے ہوئے حال سے ماضی، ماضی سے حال حال سے مستقبل اور ماضی و حال سے مستقبل کی جانب رجوع کر رہے تھے۔ اس حوالے سے انہوں نے سوانحی، تہذیبی، تنقیدی اور اجتماعی ہر قسم کی تاریخ نویسی کی۔ ان کا یہ قول انہیں زمانی مورخ ثابت کرنے کیلئے کافی ہے۔ لکھتے ہیں: "زمانے کا ہر قدم آگے ہے، کون کہہ سکتا

ہے کہ ترقی کی جو حد کل مقرر ہو چکی تھی، آج بھی قائم رہے گی" (۳۲)۔ درجہ بالا بحث کو اس زاویہ نظر سے بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

(۱) ھیگل کا نظریہ : ماضی <-------> حال

ماضی <-------> حال

(۲) سر سید کا نظریہ : حال <-------> مستقبل

(۳) شبلی کا نظریہ : ماضی <------> حال ------> مستقبل

ماضی <------> حال ------> مستقبل

﴿مصادر و حواشی﴾

(۱) قوموں اور تہذیبوں کے عروج وزوال کی یہ Therory، ٹائن بھی کی مشہور عام تصنیف A study of History میں تفصیل سے مندرج ہے۔ (2) Metcalt, Barlara Daly, Islamic Revival in British, Deoband 1860-1900, P.334 (Princton) (۳) مرتبہ سید سلیمان ندوی، مقالات شبلی، جلد دوم، ص ۶۴ (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد) (4) Afroz Uurad, Mehr, Intellectual Modernism of Shibli, P.4 (Lahore, 198) (۵) عبیداللہ قدوسی، آزادی کی تحریکیں، ص ۲۷۴ (لاہور، ۱۹۸۸ء) (۶) شبلی نعمانی، سفرنامہ روم ومصروشام، ص ۷۷ (لاہور ۱۹۶۱ء) (۷) ایضاً، ص ۲۹۲ (۸) مرتبہ سید سلیمان ندوی، مقالات شبلی، جلد دوم، ص ۱۴۸ (اسلام آباد) (۹) ایضاً، ص ۱۴۹ (۱۰) شبلی نعمانی، الغزالی، ص ۱۳۸ (لاہور، ۱۹۰۱ء) (۱۱) شبلی نعمانی، الکلام، ص ۱۱ (کراچی، ۱۹۶۴ء) (۱۲) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۸۲۳ (اعظم گڑھ، ۱۹۴۳ء) (۱۳) ایضاً، ص ۸۲۴ (۱۴) شبلی، سفرنامہ روم ومصروشام، ص ۳۲۶ (لاہور، ۱۹۶۱ء) (۱۵) سید سلیمان ندوی، حیات شبلی، ص ۸۲۲ (۱۶) شبلی، الکلام، ص ۱۹ (کراچی ۱۹۶۴ء) (۱۷) اسکی تفصیل ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تصنیف ہندی اردو تنازع، میں دیکھی جا سکتی ہے۔ (۱۸) محمد امین زبیری، تذکرہ سرسید، (لاہور، س ن) (۱۹) مرتبہ سید سلیمان ندوی، مقالات شبلی، جلد ہشتم، ص ۱۴۴ تا ۱۴۶ (۲۰) مرتبہ سید سلیمان ندوی، کلیات شبلی (اردو) ص ۹۶ (نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، س ن) (۲۱) ایضاً، ص ۵۵ (۲۲) ایضاً، ص ۹۷ (۲۳) ایضاً، ص۔۔۔ (۲۴) حیات شبلی، ص ۲۹۰ بحوالہ سابقہ (۲۵) شبلی نعمانی، الفاروق، ص ۴۴ (کراچی، س ن) (26) Hegel, Geage Wilhem, Pnilosophy of Hegel, P-20 (London 1960) (۲۷) مبارک علی، تاریخ اور روشنی، ص ۱۹ (لاہور، ۱۹۸۶) (۲۸) فاضل مشہدی، مقالات شبلی کا مقام، ۔۔۔ شمارہ ۲۶، لاہور، جنوری ۱۹۹۴ء (۲۹) طیبہ خاتون، اردو میں ادبی نثر کی تاریخ، ص ۵۷ (دہلی، ۱۹۸۹ء) (۳۰) جمیل جالبی، معاصر ادب، ص ۱۵۷، (لاہور، ۱۹۹۱ء) (۳۱) عبدالقیوم، حالی کی اردو نثر نگاری، ص ۳۰۹ (لاہور، س ن) (۳۲) شبلی نعمانی، المامون، ص ۱۵۷ (لاہور، ۱۹۶۰)۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مولوی محمد عبدالرحمٰن البازی

دنیائے علم کا مینار

شیخ الحدیث والتفسیر مولانا محمد موسیٰ الروحانی البازی طیب اللہ آثارہ

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

۱۹۔اکتوبر بروز سوموار سسکتی و آہیں بھرتی مغموم و آداس شام کو محدث اعظم نجم المفسرین، زبدة المحققین العلامة شیخ الشیوخ مولانا محمد موسیٰ الروحانی البازی طیب اللہ آثارہ، واعلی اللہ درجاتہ بھی اپنے رب سے جا ملے اور اس شان سے جا ملے کہ اللہ ہی کے گھر میں...... اللہ ہی کے ذکر میں مشغول تھے کہ موت آئی کہ دوست کا پیغام آگیا...... دل نے مزید دھڑکنے سے انکار کر دیا...... آخری بار جو دھڑکا تو اللہ ہی کے نام پر دھڑکا...... یہ دل عجب دھج سے زندہ رہا اور اب جب یہ خاموش ہوا تو اسکی گونج ایک دنیا میں پھیلی ہوئی ہے۔ ایک دنیا میں سنی جا سکتی ہے...... اس کے چرچے ایک دنیا کے سینوں میں ہیں...... اس کیلئے ایک دنیا تڑپ رہی ہے، ایک دنیا رو رہی ہے...... اور ایک دنیا کی زبانوں پر دعائیں ہیں...... زبانیں تعریف و توصیف میں رطب اللسان ہیں، ہاتھ مغفرت کیلئے اٹھ گئے ہیں: فموتک موتُ عالَمِنا بأرضٍ مع سمٰواتٍ

فیبکی کل مَن فیها ویبکینا ویؤلمنا

"یعنی آپکی موت زمین و وسیع سماوات سمیت سارے عالم کی موت ہے۔ پس عالم کے کل سکان خود بھی رو رہے ہیں اور ہمیں بھی رلاتے ہوئے غمگین کرتے ہیں"۔ یوں تو موت سنت بنی آدم ہے اور اس سے کسی کو مفر نہیں، یہاں جو بھی آیا، جانے ہی کیلئے آیا، لیکن بعض حضرات کی زندگی کی طرح ان کی موت بھی لائق رشک ہوتی ہے۔ رب کائنات نے ایسا حسین اور مبارک خاتمہ انہیں نصیب فرمایا جو ہر مسلمان کیلئے قابل رشک ہے۔ دین متین کا یہ خادم و مجاہد جو قال اللہ و قال الرسول ﷺ کے ماحول میں پروان چڑھا تھا۔ قال اللہ و قال الرسول ﷺ ہی کی بات کرتا کرتا دنیا

سے رخصت ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

یوں تو ہر ایک نے ایک نہ ایک دن یہ راہ ضرور دیکھنی ہے مگر کچھ شخصیات ایسی بھی ہوتی ہیں جنکی موت صرف فرد واحد کی موت ہی نہیں بلکہ پوری ملت کی موت ہوتی ہے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے۔ "موت العالم موت العالم" خصوصاً اگر رخصت ہونے والے کا وجود دنیا کیلئے باعث رحمت ہو انکی ذات سے عالم اسلام کی خدمات وابستہ ہوں تو ان کا صدمہ ایک عالم کی بے کسی، بے بسی و محرومی اور یتیمی کا موجب بن جاتا ہے۔

فروغ شمع تو باقی رہے گا صبح محشر تک		مگر محفل تو پروانوں سے خالی ہوتی جاتی ہے

محدث اعظم، شیخ المشائخ مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی نور اللہ مرقدہ واعلی اللہ درجاتہ بیشمار خوبیوں کے مالک تھے اور شاید ہی کوئی خوبی ایسی ہو گی جو حضرت شیخؒ کو اللہ تعالیٰ نے عطا نہ فرمائی ہو۔ وہ اپنے عہد میں دنیا بھر کے ذہین لوگوں میں سے ایک تھے۔ لاریب! انکی شخصیت سدا یادگار رہیگی، اس وقت انکی موت سے چمنستان اسلام اجڑ گیا ہے۔ علماء یتیم ہو گئے ہیں اور خصوصاً ہمارا گھرانہ بہت زیادہ نڈھال ہو گیا۔ ان کے سامنے ہمیشہ ہی میں اپنی مشکلات پیش کرتا تھا۔ مختلف مسائل کے بارے میں ان سے سوالات کرتا تھا، متعدد مشکلات کا حل طلب کرتا تھا اور وہ ہمیشہ ہی شفقت و محبت سے میرے سوالات کا جواب دیتے اور مشکلات کو حل کر دیتے تھے۔ انکی باتیں بے شمار ہیں ان کے سنانے والے بھی بے شمار ہیں۔ انکی زندگی کے مختلف گوشے مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور زندگی ایک کھلی ہوئی کتاب کیطرح موجود ہے:

کچھ قمریوں کو یاد ہیں کچھ بلبلوں کو حفظ
عالم میں ٹکڑے ٹکڑے میری داستان کے ہیں

شیخ الحدیث مولانا عبدالحق حقانی رحمہ اللہ اکوڑہ خٹک کے مرثیہ میں حضرت شیخؒ اپنے شہرہ آفاق منظوم مرثیہ "فتح الصمد" میں (جس میں چھ سو سے زائد اسمائے اسد مذکور ہیں) شاید یہ اشعار اپنے لئے کہہ گئے:

لموتک قد بکت ارض وعرش ثم کرسی

آپکی موت پر ماتم کناں ہیں زمین، عرش، کرسی
والافلاک والنجمُها وکعبتنا وزمزمنا
آسمان، ستارے، کعبۃ اللہ اور زمزم شریف
وپاکستانُ مع ھندِ مساجدُنا، مدارسُنا
نیز غمگین ہے سارا پاکستان، ہند، ہماری مسجدیں، مدارس
وارضُ اللہ، مکتُنا، مدینتنا، یَلمَلَمُنا
اور اللہ کی پاک زمین یعنی مکہ مکرمہ، مدینہ طیبہ اور یلملم
ویبکی الطیرُ والحیتان ثم السھلُ مَع جَبَل
نیز روتے ہیں پرندے، مچھلیاں، ہموار میدان اور پہاڑ
ویبکی الجن ثم الانس اذقدفاضَ کَیخَمُنا
نیز کل جن وانس آہ و بکا کر رہے ہیں کیونکہ علم کے بڑے سلطان انتقال کر گئے۔

کسی شخص کی عزت وعظمت کا اندازہ اس کے نام ونسب سے نہیں، بلکہ سیرت وکردار اور علم وفضل سے ہوتا ہے۔ تاہم نام ونسب سے بھی بسا اوقات کسی کی خاندانی روایات، علمی برتری اور روحانی وجاہت سامنے آجاتی ہیں۔ میں اسے اللہ رب کائنات کا فضل وکرم سمجھتا ہوں کہ میرے والد ماجد محدث اعظم مولانا محمد موسیٰ البازیؒ کو قدرت نے یہ دونوں شرف عطا فرمائے۔ ہمارا خاندان کئی پشتوں سے علم وفضل اور روحانیت کے حوالے سے پہچانا جاتا ہے، یہاں روحانی علوم کو سینہ بہ سینہ سکھایا اور چلایا جاتا ہے جس سے انسان کا باطن روشن ہو جاتا ہے۔ میرے دادا جان مولوی شیر محمدؒ ایک عالم وعارف انسان تھے۔ وفات کے بعد والد صاحبؒ قبر پر زیارت کیلئے حاضر ہوتے تو قبر میں سے قرآن حکیم کی تلاوت کی آواز سنائی دیتی، خصوصاً "سورۂ ملک" کی تلاوت کی آواز آتی۔ حدیث شریف میں سورۂ ملک کے بارے میں آیا ہے کہ یہ سورۃ اپنے پڑھنے والے کیلئے شفاعت کا باعث بنتی ہے۔ یہ انکی عجیب وغریب کرامت تھی جس کو والد ماجدؒ نے اپنی کتاب "اثمار التکمیل" (یہ حضرت شیخؒ کی تصنیف کردہ بیضاوی شریف کی شرح "ازھار التسھیل" کا دو جلدوں میں مقدمہ

ہے، اصل کتاب تقریباً پچاس جلدوں پر مشتمل ہے) میں بھی تفصیلاً ذکر فرمایا ہے۔ اس طرح ہمارے جد امجد احمد روحانی بھی بہت بڑے عالم اور صاحب فضل و کمال انسان تھے۔ افغانستان میں غزنی کے پہاڑوں کے مضافات میں ان کا مزار اب بھی مرجع عوام و خواص ہے۔ اس طرح ہمارا خاندان برسوں سے علم کا گہوارہ چلا آرہا ہے۔ مجموعی طور پر میں نے اپنے والد کو اپنی شعوری زندگی میں پانچ حیثیتوں سے دیکھا ہے: باپ، مربی، استاد، عالم، مصنف۔

بڑے ہو کر جب مجھے اچھے برے کی تمیز ہوئی تو میرے چھوٹے سے ذہن میں انکی جو قد آور شخصیت تھی وہ چھوٹی نہیں ہوئی بلکہ پہلے سے زیادہ بڑی اور پرکشش نظر آنے لگی۔ اگر بات گھر کے معاملے سے کی جائے تو مجھے اپنے عہد شباب سے لڑکپن کے دور تک جانا ہوگا۔ جہاں میں تھا اور انکی گود تھی، ان کے شانے تھے اور میرا وجود، میرا کھیلنا اور ان کا کھلانا تھا، میری طفلانہ شوخیاں تھیں اور ان کا محبت آمیز تبسم تھا، میرا تکرار تھا اور ان کا پیار، میرا مچلنا اور ان کا بہلانا تھا، میری ضد اور ان کی دانائی تھی، میرا ہاتھ اور ان کی انگلی تھی، وہ مجھے ساتھ لیکر چلتے تھے اور میں ان کے ساتھ چل کر نہ صرف خوش ہوتا تھا بلکہ ہمیشہ کوئی نئی بات سمجھتا اور سیکھتا تھا، لیکن گیا وقت واپس نہیں آسکتا۔ بیتے لمحے پلٹ نہیں سکتے۔ گزرے دور کا آنا ممکن نہیں، گزشتہ ساعتیں حال میں نہیں آسکتیں، ماضی کو حال و مستقبل نہیں بنایا جاسکتا کیونکہ یہ طویل داستان ہے جسے زبان و قلم سے بیان نہیں کیا جاسکتا، صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ بحیثیت باپ وہ قابل فخر تھے۔ وہ صرف "حقوق والدین" کے معلم ہی نہ تھے بلکہ حقوق اولاد بھی ان کے پیش نظر رہتے تھے۔ باپ کی حیثیت میں اولاد کیلئے جو شفقت و محبت ہر باپ کو قدرت نے دی ہے وہ ان کو بھی دی تھی، لیکن میرے احساسات یہ ہیں کہ یہ نعمت قدرت نے ان کو زیادہ فراوانی سے عطا فرمائی تھی۔ اولاد کیلئے رزق حلال فراہم کرنا، انکی جائز ضروریات کو جائز طریقے سے پورا کرنا، انکی صحیح رہنمائی کرنا، حتیٰ کہ ان کو شفقت کی نظر سے دیکھنا بھی عبادت ہے۔ جب وہ گھر میں کوئی بات کرتے یا کسی سوال کا جواب دیتے تو انکی باتوں میں علم و حکمت کی تعلیم ہوتی اور ہم محسوس کرتے کہ ہمارے والد کی علمی اور تدریسی زندگی کی طرح انکی خانگی زندگی بھی بہت خوبصورت ہے۔ وقت کی اہمیت میں نے ان سے سیکھی۔ الخ

کو کام، کام اور کام میں منہمک دیکھ کر مجھے اندازہ ہوتا کہ وقت بہت قیمتی شے ہے، اسے ضائع نہیں کرنا چاہیئے۔ جوں جوں میں عمر کی منزلیں طے کرتا گیا والد صاحبؒ کی بے تکلفی کم ہوتی چلی گئی، یہاں تک کہ جب میں سوچنے سمجھنے کے قابل ہوا تو میرے اور ان کے مابین ایک پر وقار سا حجاب اور ایک غیر محسوس سا تکلف پیدا ہو چکا تھا۔ انہوں نے مجھے تمیز سکھانے کیلئے سختی کے بجائے حکمت استعمال کی۔ ان کا رویہ ہر ایک کے ساتھ ہمیشہ حکیمانہ رہا۔ مجھے کسی کے بتائے بغیر خود بخود ہی معلوم ہو گیا کہ والد کے ساتھ بچے ہنسی مذاق کرتے ہیں نہ بے تکلف ہوتے ہیں۔ ان کے سامنے زیادہ بولتے ہیں نہ شوخیاں کرتے ہیں، وہ ایک محترم ہستی ہوتی ہے۔ ان کا ہمیشہ اور ہر حال میں احترام کیا جاتا ہے۔ یہ سب کچھ ان کی حکیمانہ تربیت کا اثر تھا۔ بحیثیت مربی انہوں نے اپنی اولاد کی پرورش میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی، بچوں کی تعلیم و تربیت، بود و باش، رہائش، خوراک اور جائز ضروریات کا انہوں نے ہمیشہ خیال رکھا اور ساتھ ہی یہ احساس بھی دلایا کہ جائز ضروریات وہی ہوتی ہے جو جائز طریقے سے حاصل کیا جائے جس کی ضرورت کیلئے انسان کو ناجائز طریقے اختیار کرنے پڑیں، وہ جائز نہیں ہوتی۔ ان کے طفیل ہمیں جو کچھ میسر تھا، کافی تھا۔ میں نے یا میرے بہن بھائیوں میں سے کسی نے آج تک یہ کبھی محسوس نہیں کیا کہ ہم حصول تعلیم کے سلسلے میں اور ضروریات زندگی کے حصول کے سلسلے میں کسی سے پیچھے ہیں یا کوئی ہم سے بہتر پوزیشن کا مالک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انہوں نے ہمارے لئے وسیع اراضی، بینک بیلنس یا کوئی دوسری بڑی جائیداد بنائی بلکہ انہوں نے ہماری تربیت اس انداز میں کی کہ ہم نے تھوڑے کو ہمیشہ بہت سمجھا اور جو کچھ میسر آیا اسی پر قناعت کی۔ بحیثیت استاد وہ سخت گیر واقع ہوئے تھے۔ تعلیمی کوتاہی ان کے نزدیک ناقابل معافی جرم کی حیثیت رکھتی تھی، لیکن اس کے ساتھ وہ نرم خو بھی تھے۔ اگر سبق یاد کرنے پر ان پر جلال غالب آجاتا تھا، تو سبق یاد کرنے پر ان کا جمال بھی دیدنی ہوتا تھا۔ میں نے ان کے چہرے پر ہمیشہ نرمی کے آثار دیکھے ہیں لیکن جب وہ میرا امتحان لیتے تو ان کے چہرے پر سے نرمی کے آثار یک لخت غائب ہو جاتے تھے۔ اگر سوال کا صحیح جواب نہ دیتا تو سخت گرفت اور باز پرس کرتے تھے۔ ظہر کی نماز کے بعد طلباء جس محبت و عقیدت سے درس ترمذی کیلئے حضرت شیخؒ کا گھر کے باہر انتظار کرتے وہ

منظر بھی دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا، جو نہی حضرت شیخؒ درس کیلئے گھر سے باہر تشریف لاتے طلباء کرام عقیدت و محبت کے جذبہ سے سرشار انکی جانب دوڑ پڑتے۔ ہر ایک کی خواہش ہوتی کہ وہ حضرت شیخؒ سے کتابیں لے اور پھر دینی طلباء کے جھرمٹ میں حضرت شیخؒ جس وقار کے ساتھ تشریف لے جاتے تو یوں معلوم ہوتا جیسے عصر دوراں کے امام الترمذی جا رہے ہیں۔ سال کے آخر میں ترمذی شریف کے اختتام پر خاص دعا کرواتے دوران دعا انکی وجد انگیز آہ وزاری سخت سے سخت دلوں کو بھی تڑپا دیتی اور انسان گریہ وزاری پر مجبور ہو جاتا۔ ایسی مقبول دعا اس سے پہلے کسی کان نے نہیں سنی ہوگی اور اس وقت طاری ہونے والا رقت انگیز منظر کسی آنکھ نے نہیں دیکھا ہوگا۔ درس دینے کا انداز حکیمانہ ہوتا تھا۔ درس دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے علم وآگہی کے چراغ جل رہے ہیں۔ وہ پڑھانے سے زیادہ سمجھانے کے قائل تھے، انکی سمجھائی ہوئی بات ناقابل فراموش ہوتی تھی، مشکل ترین بحث کو چند آسان جملوں میں اس طرح سمجھا دیتے کہ وہی مشکل بحث سب سے زیادہ آسان نظر آتی اور اسے انتہائی آسان الفاظ میں بیان کرنے کی قدرت حاصل ہو جاتی۔

حضرت شیخؒ بہت زیادہ وسیع النظر اور وسیع الظرف تھے، ان کے سامنے ہر وقت فقہاء کرام کی آراء رہتی تھیں۔ مسائل کے سلسلے میں سب سے پہلے مخالف کے نقطہ نگاہ کو تحمل اور سنجیدگی کیساتھ سنتے اور اس کے بعد پہلے اس کے دلائل کو رد فرماتے اور بعد میں اپنے دلائل (جو کہ فقہاء کی آراء پر مشتمل ہوتے تھے) دیتے۔ بحیثیت استاد انکی ایک خوبی ایسی بھی دیکھنے میں آئی جو صرف انکی ذات سے مخصوص تھی، کسی اور شیخ میں وہ خوبی نہیں تھی، یہ خوبی انہیں قدرت نے وہبی طور پر عطا فرمائی تھی۔ کسی سوال کا جواب تو دیکھ کر یا دیکھے بغیر تمام علماء دیتے ہیں۔ حضرت شیخؒ کو قدرت نے تدریس میں استخراج جواب جدید کا بھی بڑا ملکہ عطا فرمایا تھا۔ ہر مسئلے پر حضرت شیخؒ کی اپنی ایک رائے تھی وہ نفس کتاب اور حواشی میں درج جولانات سے ہٹ کر جولانات جدید اور دلائل بھی دیتے تھے اور وہی جولانات اور دلائل سب سے زیادہ تسلی بخش ہوتے اور عجیب بات یہ تھی کہ یہ جولانات جدید اور دلائل جدید درس دیتے دیتے ذہن میں آتے لیکن عجز وانکساری کا یہ عالم تھا کہ جولانات اور دلائل جدید دے کر طلباء سے فرماتے کہ یہ جولانات اور دلائل اللہ تعالیٰ نے ابھی میرے

ذہن میں ڈالے ہیں، کسی کتاب میں آپ کو نہیں ملیں گے۔ یعنی ہر بات کو اللہ تعالیٰ کیطرف منسوب کرتے کہ بندہ کچھ نہیں وہی ذات سب کچھ ہے۔ یہ عاجزی وانکساری انکی سینکڑوں تصنیف شدہ کتابوں میں بھی نظر آتی ہے۔ مصنفین کی عام طور پر اپنے نام کیساتھ مختلف القاب بھی لگاتے ہیں مگر حضرت شیخؒ نے اپنی ہر تصنیف شدہ کتاب پر عاجزی وانکساری کی راہ اپناتے ہوئے اپنے نام کیساتھ ہمیشہ عبد فقیر یا عبد ضعیف (کمزور بندہ) لکھا جو انکی عظمت ومتانت اور انکساری کی واضح مثال ہے۔ عجز وانکساری کا ساتھ حالت نزع میں بھی نہ چھوڑا اور ایسی حالت میں بھی زبان ادب کا دامن پکڑے انکساری وعاجزی کی حدود میں رہتے ہوئے اس ذات وحدہ لاشریک لہ کو اس انداز سے پکارتی رہی:

"الھی انا عبدک الضعیف" : یااللہ! میں تیرا کمزور بندہ ہوں۔

بحیثیت عالم ان کا مقام بہت بلند تھا لیکن اگر اس سے مراد مجرد علم ہے تو اس بارے میں قطعیت کیساتھ کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ کس پائے کے عالم تھے۔ اس کا فیصلہ کرنا خود علماء کیلئے مشکل ہے جنہوں نے ان کے فقہی استدلال سنے۔ انہوں نے انہیں فقیہ ملت مانا، جنہوں نے حدیث کی خوشبو سے جہاں کو مہکاتے دیکھا، انہیں محدث اعظم نظر آئے، جنہوں نے تفسیر کے موتی لٹاتے دیکھا انہوں نے مفسر کبیر قرار دیا، جنہوں نے منطق وفلسفہ کا خزانہ بانٹتے دیکھا انہوں نے معقولات کا امام گردانا۔ جنہیں علم فلکیات کے درس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا انہوں نے ماہر فلکیات اور عظیم ریاضی دان سمجھا۔ اس امر میں کوئی شک نہیں کہ حضرت شیخؒ بحر العلوم میں غوطہ زن ہونے اور گہرائیوں میں سے موتی سمیٹنے کے ماہر تھے، اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں کہ وہ میدان علم کے شہسوار تھے، وہ کتنے بڑے عالم تھے؟ یہ طویل بحث ہے تاہم اس بحث کو یوں سمیٹا جاسکتا ہے کہ پھل سے بھر ادرخت جھکا ہوتا ہے۔ اہل علم کی پہچان یہ ہے کہ ان پر خشیت الٰہی کا غلبہ ہوتا ہے۔ ان کا علم انہیں مغرور بنانے کے بجائے منکسر بنادیتا ہے۔ وہ خدا سے ڈرنے والے ہوتے ہیں۔ ہم نے انہیں گھریلو زندگی میں دوسروں سے بڑھ کر دیکھا ہے، انکی راتیں یاد خدا سے مہکتی اور دل خوف خدا سے لرزتا رہتا تھا۔ بڑائی ان کے قریب سے بھی نہیں گزرتی تھی، انکسار ان کا رفیق تھا۔ وہ سارا دن اپنی تصانیف اور درس وتدریس میں مصروف رہتے اور رات گئے تک تصنیفات اور مطالعہ میں

غرق رہتے۔ اس کے باوجود ایسا کبھی نہیں ہوا کہ تہجد کا وقت انہوں نے بستر پر لیٹ کر گزار دیا ہو۔ ہم نے انہیں راتوں کو خدا کے دربار جلال و جمال میں سر بسجود پایا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو علمیت میں بڑا مقام عطا فرمایا تھا۔ علماء کرام مسائل کے سلسلے میں انکی طرف رجوع کر کے پھر اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کا بہت بڑا مقام تھا اور یہ ان کے عنداللہ مقبول ہونے کی علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انکی گفتگو اور آخری مجلس اس جگہ (مسجد) کو مقرر فرمایا جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک دنیا میں سب سے پسندیدہ مقام ہے اور پھر انکی قبر مبارک سے خوشبو کا جاری ہونا (جو الحمدللہ اب تک جاری ہے) انکی ولایت کی کامل نشانی ہے۔ جسکو فقیر البازی آگے چل کر تفصیلاً ذکر کرے گا۔ (انشاء اللہ)

وہ ایک عالم باعمل، عارف باللہ، باضمیر اور باکمال انسان تھے۔ نبی کریم ﷺ کا ارشاد مبارک ہے کہ کہ "مومن وہ ہے جس کو دیکھ کر خدا یاد آجائے"۔ آپکی نگاہ کی تاثیر سے دلوں کی کائنات بدل جایا کرتی تھی، آپکی صحبت میں چند لمحے گزارنے سے اسلام کے عہد زریں کے بزرگوں کی صحبتوں کا گمان ہوتا تھا۔ حضرت شیخؒ میں قرون اولیٰ والی سادگی تھی، ان کو دیکھ کر قرون اولیٰ کے مسلمانوں کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔ آنکھوں میں تدبر کی گہرائیاں، آواز میں سنجیدگی اور متانت کا آہنگ نیچے دری پر آلتی پالتی مارے گاؤ تکیئے کا سہارا لئے حضرت شیخؒ کو معتقدین کے سامنے میں نے اکثر قرآن وحدیث کے اسرار و رموز کھولتے دیکھا۔ آپ منقولات و معقولات کے جامع تھے۔ علم تفسیر، علم اصول تفسیر، علم حدیث، علم اصول حدیث، علم فقہ، علم اصول فقہ، علم کلام، علم منطق، علم فلسفہ، علم نحو وصرف، علم ادب عربی، علم تاریخ، علم ہیئت قدیمہ یونانیہ، علم ہیئت جدیدہ کوبرنیکسیہ وغیرہ تمام علوم وفنون پر مہارت تامہ رکھتے تھے۔ ان علوم رائجہ و معروفہ کے علاوہ کئی ایسے علوم وفنون کے بھی ماہر تھے جن سے عام اہل علم ناواقف تھے۔ علوم وفنون میں یہ جامعیت کاملہ اس عصر میں بہت کم علماء کو حاصل ہے۔ حضرت شیخؒ نے اکثر فنون اسلامیہ قدیمہ وفنون علوم جدیدہ میں تصانیف کی ہیں۔ تصنیف و تالیف میں انہیں خاص ملکہ حاصل تھا۔ آپ کے علمی کارنامے زمانہ حال میں نہ صرف قابل داد ہیں بلکہ قابل رشک بھی ہیں۔ (جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

بحث و نظر

سلسلہ نمبر 2

جناب مفتی مختار اللہ جہانگیروی حقانی
مدرس دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک

اختلافِ مطالع کے اعتبار و عدم اعتبار کی تحقیق

(قسط نمبر 3)

(٦) عن ابن عباس قال جاء اعرابی الی رسول اللهﷺ فقال انی رأیت الهلال یعنی رمضان فقال أتشهد ان لااله الاالله قال نعم قال أتشهدان محمداً رسول الله قال نعم قال قم یا بلال فأذن فی الناس فلیصوموا غداً" (المحلی ٣/٧ ٥٣)

(عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا اے اللہ کے رسول ﷺ میں نے چاند دیکھا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا! کیا یہ شہادت دیتے ہو کہ اللہ ایک ہے وہی عبادت کے لائق ہیں۔ اعرابی نے کہا ہاں۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ کیا تم یہ گواہی دیتے ہو کہ بیشک محمد ﷺ اللہ کا رسول ہے۔ اعرابی نے کہا ہاں، جس پر آپ ﷺ نے فرمایا اے بلال! لوگوں میں اعلان کرو کہ کل روزہ رکھیں)۔

(٧) حسین بن الحارث الجدلی...... ان امیر مکة هوالحارث بن حاطب... خطب فقال عهدالینا رسول اللهﷺ ان ننسک لرؤیته فان لم نره وشهداعدل نسکنا بشهادتهما (المحلی ٣/٨ ٥٣) (ترجمہ : حسین بن حارث الجدلی کہتے ہیں کہ مکہ کے گورنر حارث بن حاطبؓ نے خطبہ میں فرمایا کہ رسول ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم چاند کی رؤیت پر حج کریں اور اگر ہم نے چاند نہیں دیکھا اور دو عادل گواہوں نے گواہی دی تو ہم انکی گواہی پر حج کرینگے)۔ مذکورہ روایت سے استدلال کو سمجھنے کیلئے چند باتیں ذھن نشین رکھنی چاہئیں :

(١) تمام امت کا اجماع ہے کہ حج میں عرفہ کا ایک ہی دن ہے۔ (٢) اگر اس دن عرفہ کو حاجی نہ گیا تو اس کا حج نہ ہوگا۔ (٣) اور عرفہ کے دن جس وقت بھی حاجی عرفات کے میدان میں داخل ہو جائے اگرچہ ایک لمحہ کیلئے کیوں نہ ہو اس کا حج ادا ہوگا۔ اب جب عرفہ کا دن ایک ہے اسی طرح

اس دن حاجی کا وہاں جانا ضروری ہے اگرچہ پورے دن میں ایک لمحہ کیلئے ہو تو حج ادا ہو جائے گا، تو آج کے اس برق رفتار دور میں اگر کوئی عرفہ کے دن صبح جہاز میں سوار ہو کر دوپہر کو عرفات پہنچ جائے تو حج ادا ہو جائے گا۔ لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ ہمارا عرفہ آج نہیں بلکہ کل ہے اور رات کو روانہ ہو کر کل عرفات پہنچ جائے تو سب کے نزدیک حج ادا نہ ہوگا۔ تو معلوم ہوا کہ جملہ مسلمانوں کا عرفہ کا دن ایک ہے اور اس کا تعلق بھی رؤیت ہلال سے ہے، اس سے معلوم ہوا کہ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں، ورنہ پھر ہر اقلیم کے لئے اپنا اپنا عرفہ ہوگا اور انکا حج اسی دن ادا ہوگا۔ اس لئے آپ ﷺ کا ارشاد کہ مناسک حج رؤیت ہلال سے شروع کرو اگر سب نے نہ دیکھا تو دو ثقہ آدمیوں کی رؤیت کی شہادت سب کیلئے کافی ہے۔ جسکو امیر مکہ حارث بن حاطب نے خطبہ میں پیش کیا۔

(۸) عن ابن عمر قال، قال رسول الله ﷺ انا امة امية لانكتب ولا نحسب، الخ
(آپ ﷺ نے فرمایا کہ بیشک ہم انپڑھ امت ہیں ہم نہ کتابت جانتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں)
(صحیح البخاری ۱/)۔ اس روایت کو بھی اگر غور سے دیکھا جائے اور اسمیں غور کیا جائے تو اس سے بھی یہی متفقہ مسئلہ ثابت ہوگا اسلئے کہ اختلاف مطالع کے اعتبار کرنے میں اسکی تحدید کیلئے علم ھئیت کے دقائق اور اسکے مشکل حسابات کا علم رکھنا ہوگا جسکا شریعت نے ہمیں مکلف نہیں بنایا ہے۔

علامہ ظفر احمد عثمانی ؒ فرماتے ہیں: "واعلم ان دليل من لم يقل باعتبار اختلاف المطالع قول عليه السلام انا امة امية لانكتب ولانحسب متفق عليه مشكوة ۱۶۶/۱ فان اعتباره يتوقف على دقائق الهيئة والحساب التي لانكلف بها فاعتباره يتلزم التكليف بها وهو منتف بالحديث فينفي الملزوم" (اعلاء السنن ۹/ ۱۰۳)۔ (ترجمہ: جان لو بیشک جو لوگ اختلاف مطالع کا اعتبار نہیں کرتے ان کی دلیل آپ ﷺ کا یہ فرمان: بیشک ہم ایسی امت ہیں کہ ہم نہ لکھنا جانتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں (متفق علیہ مشکوۃ) بیشک اختلاف مطالع کا اعتبار علم ہیئت اور علم حساب کے دقائق پر موقوف ہے اور ہم اس کے مکلف نہیں، پس اعتبار دینے میں اس سے تکلیف کا استلزام ہے جو حدیث شریف سے نفی (ختم) ہو چکی ہے۔ پس ملزوم (اختلاف مطالع کا اعتبار) بھی ختم ہوا۔

علامہ عثمانیؒ کی اس وضاحت سے یہ معلوم ہوا کہ اعتبار اختلاف مطالع میں علم ہئیت کے دقائق اور حساب کا علم رکھنا ہوگا اسکی تحدید اسی پر موقوف ہے تو جب شریعت مقدسہ نے ہمیں اس کا مکلّف نہیں کیا تو لازم کی نفی سے ملزوم جو اعتبار اختلاف مطالع ہے وہ بھی ختم ہوا۔ اسی طرح مولانا محمد ادریس کاندہلویؒ کی تشریح حدیث بھی کچھ اس طرف میلان رکھتی ہے چنانچہ فرماتے ہیں : "قوله لانكتب ولانحسب ان العمل بالحساب على مايتعارفه المنجمون ويتعارفونه ليس مما تعهدنا ولا امرنا اذليس ذلك من هدينا وسمتنا في شئي " (تعلیق الصبیح ۲/۷۷۳)(ترجمہ : آپؐ کا فرمان ہے : ولانکتب الخ بیشک حساب پر عمل ہے جو اہل نجوم کے ہاں متعارف ہے اور ہمیں اسکا مکلّف نہیں بنایا گیا اور نہ ہمیں حکم ہوا ہے اور نہ یہ ہماری شریعت اور مسلک میں کوئی حیثیت رکھتا ہے)۔ اور ظاہر بات ہے کہ آجکل کے جدید حسابات جو کمپیوٹر وغیرہ جدید الات کے ذریعے کیے جاتے ہیں شریعت میں اسکا حکم نہیں ہوا اسکے مکلّف بنانے میں تکلیف مالایطاق کا سامنا ہوتا ہے جو شرعاً مذموم ہے جبکہ اختلاف مطالع کا اعتبار اسی حسابات پر موقوف ہے، اسلئے حدیث مذکورہ اور تشریحات محدثین اسکے عدم اعتبار کی طرف مشیر ہیں۔

(۹) عن الحارث عن علي اذاشهدرجلان على رؤية الهلال افطروا" (المحلی ۳/۵۳۸) (ترجمہ : حضرت حارثؓ حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں کہ آپؓ نے فرمایا کہ جب دو گواہ چاند دیکھنے کی گواہی دے دیں تو تم افطار کرو)۔ حضرت علیؓ کا فرمان بھی عدم اعتبار کی طرف نشاندہی کرتا ہے اس لیے کہ آپ نے فرمایا کہ جب بھی دو آدمی چاند کی رؤیت دیکھنے کی شہادت دیں تو تم یعنی اے مسلمانوں افطار یعنی عید کرو۔

(۱۰) ان منقولی دلائل کے علاوہ جمہور علماء اس کو قیاس سے بھی ثابت کرتے ہیں کہ بلاد قریبہ میں تو ایک رؤیت سب کیلئے کافی ہے تو اسی طرح بلاد بعیدہ میں بھی وہی رؤیت کافی ہے۔ چنانچہ شیخ وھبہ الزحیلی فرماتے ہیں :" واما القياس : فانهم قاسوا البلدان البعيده على المدن القريبة من بلد الرؤية اذلافرق والتفرقة تحكم لاتعتمد على دليل " (الفقہ الاسلامی وادلتہ ۲/۶۰۹)

(ترجمہ: دلیل قیاسی، بیشک جمہور نے بلاد بعیدہ کو بلاد قریبہ پر باعتبار رؤیت کے قیاس کیا ہے، اس میں کوئی فرق نہیں، تفرقہ کا فیصلہ اس دلیل پر ہے جس پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا ہے)۔

خلاصہ: ان دلائل کے پیش نظر جمہور فقہاء کرام و محدثین عظام اختلاف مطالع کو اعتبار نہیں دیتے بلکہ ایک جگہ کی رؤیت دوسرے مقامات (قریب ہوں یا بعید) کے لئے معتبر اور حجت مانتے ہیں اس میں مسلمانوں کی اجتماعی شکل وصورت سامنے آئے گی جسکی طرف اسلام داعی ہے۔

عدم اعتبار کے دلائل: گذشتہ صفحات میں جمہور علماء وفقہاء کے دلائل ذکر کیے گئے ہیں۔ اب باقی دو نظریوں (۱) جو ہر شہر کیلئے اپنی اپنی رؤیت ضروری سمجھتے ہیں (۲) جو بلاد بعیدہ میں اختلاف مطالع کو معتبر مانتے ہیں) کے دلائل ذکر کیے جاتے ہیں۔ ان حضرات کا سب سے بڑا مستدل حدیث کریبؓ ہے جس میں حضرت عبداللہ بن عباس نے انکی شہادت کو رد فرما کر اس پر عمل نہ کرنے کا حکم دیا، چنانچہ صحیح مسلم میں ہے: "عن کریب ان ام الفضل بنت الحارث بعثته الی معاویة بالشام قال فقدمت الشام قضیتُ حاجتها واستهل علی رمضان وانا بالشام فرأیتُ الهلال لیلة الجمعة ثم قدمتُ المدینة فی اخرالشهرفسالنی عبدالله بن عباس ثم ذکرالهلال فقال متی رأیتم الهلال فقلتُ رایناه لیلة الجمعة فقال انت رأیته فقلتُ نعم وراه الناس وصاموا وصام معاویة فقال لکنا ایناه لیلة السبت فلانزال نصوم حتی نکمل ثلثین اونراه فقلت اولاتکتفی برویة معاویة وصیامه فقال لاهکذا امرنارسولُ الله ﷺ" (الصحیح المسلم ۱/۳۴۸)۔ (ترجمہ: حضرت کریبؓ سے روایت ہے کہ ام الفضل بنت الحارث نے انہیں حضرت امیر معاویہؓ کے پاس ملک شام بھیجا۔ حضرت کریبؓ فرماتے ہیں کہ میں شام پہنچا اور ان کا کام کرلیا اور میں وہیں تھا کہ رمضان کا چاند رونما ہوا، میں نے خود جمعہ کی شب چاند دیکھا۔ پھر رمضان کے آخر میں میں مدینہ طیبہ آیا تو مجھ سے حضرت عبداللہ بن عباس نے دریافت کیا اور چاند کا ذکر کیا اور کہا کہ تم نے رمضان کا چاند کب دیکھا؟ تو میں نے کہا کہ ہم نے جمعہ کی شب میں دیکھا۔ توانہوں نے کہا کہ آپ نے خود دیکھا بھی جمعہ کی شب کو؟ تو میں نے کہا ہاں (میرے علاوہ) اور بھی

بہت سے لوگوں نے دیکھا اور سب نے روزہ رکھا۔ حضرت معاویہؓ نے بھی روزہ رکھا۔ اس پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا مگر ہم نے تو چاند ہفتہ کی شب میں دیکھا ہے اس لئے ہم لوگ اس وقت تک روزے رکھیں گے جب تک تیس روزے پورے نہ ہو جائیں یا چاند دیکھ لیں تو میں نے کہا کہ کیا آپ حضرت معاویہؓ کے چاند دیکھنے اور روزہ رکھنے کو اپنے لیے کافی (دلیل) نہیں سمجھتے۔ انہوں نے فرمایا نہیں ہم کو رسول اللہ ﷺ نے ایسا ہی حکم دیا ہے۔ **علامہ قاضی شوکانی** فرماتے ہیں: "وحجة اهل هذه الاقوال حديث كريبؒ هذاوجه الاحتجاج به أن ابن عباس لم يعمل برؤية اهل الشام وقال فى اخرالحديث هكذامرنا رسول الله ﷺ فدل ذلک علی أنه قدحفظ من رسول الله ﷺ انه لايلزم اهل بلدالعمل برؤية اهل بلدآخر" (نیل الاوطار ۴/ ۲۰۶)

ترجمہ: "ان اقوال کے قائلین کی حجت حدیث کریبؒ ہے۔ وجہ استدلال یہ ہے کہ عبداللہ بن عباسؓ نے اہل شام کی رؤیت پر عمل نہ کیا اور آخر میں فرمایا کہ اسی طرح رسول اللہ ﷺ نے ہمیں حکم دیا ہے (یہ جملہ) اس بات پر دال ہے کہ بیشک انہوں نے رسول کریم ﷺ سے اس بات کو حفظ کیا ہے کہ ایک شہر کیلئے دوسرے شہر کی رؤیت پر عمل کرنا لازم نہیں"۔ اور یہی ظاہری حدیث سے پتہ چلتا ہے۔

الجواب: مگر ظاہری عبارت سے ہٹ کر ذرا غور اور نظر عمیق سے دیکھا جائے تو معلوم ہو جائیگا کہ اس حدیث سے استدلال کرنا درست نہیں، اس لئے کہ یہ حدیث کئی وجوہ سے مول ہے۔ اور علماء امت نے اس کے کئی جوابات دیے ہیں۔

(۱)۔ چنانچہ علامہ شوکانیؒ فرماتے ہیں:

"واعلم ان الحجة انما هى فى المرفوع من رواية ابن عباس لافى اجتهاده الذى فهم عنه الناس والمشاراليه بقول هكذا امرنارسول الله ﷺ هوقول فلانزل نصوم حتى نكمل ثلاثين والأمرالكائن من رسول الله ﷺ هوماأخرجه الشيخان وغيرهما بلفظ لاتصوموا حتى تروالهلال ولاتفطروا حتى تروه فان

غم عليكم فاكملوا العدة ثلاثين، وهذا لا يختص باهل ناحية على جهة الانفراد بل هو خطاب لكل من يصلح له من المسلمين، فالاستدلال به على لزوم رؤية اهل بلد لغيرهم من اهل البلاد اظهر من الاستدلال به على عدم اللزوم لأنه اذا رآه اهل بلد فقد رآه المسلمون فيلزم غيرهم ما لزمهم" (نیل الاوطار ۴: ۲۰۶)

ترجمہ: "پس بلاشک حجت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے اندر حدیث مرفوع سے ہے انکے اجتہاد سے نہیں جو لوگوں نے ان سے سمجھا ہے۔ اور ھکذا امرنا رسول اللہ ﷺ کا مشار الیہ فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلاثین ہے جو بخاری، مسلم اور دوسری کتب حدیث میں ان الفاظ سے مروی ہے کہ تم روزہ نہ رکھو یہاں تک چاند دیکھو اور افطار کرو یہاں تک چاند دیکھو اگر چاند تم پر مخفی ہو جائے تو گنتی تیس کی پوری کرو، اور یہ کسی علاقے کے ساتھ انفراداً خاص نہیں ہے بلکہ یہ خطاب مسلمانوں میں سے ہر اس کے لئے ہے جو اسکی صلاحیت رکھتا ہو، پس اس حدیث سے استدلال ایک شہر کی رویت کا دوسرے شہر کے لئے حجت نہ ہونے کے بجائے ایک شہر کی رویت دوسرے بلاد کیلئے حجت ہونے میں زیادہ واضح ہے اس لئے کہ جب ایک شہر والے چاند کی رویت کریں تو گویا کہ تمام مسلمانوں نے چاند دیکھا تو دیکھنے والے کے علاوہ پر وہ حکم لازم ہوگا جو ان کے دیکھنے والوں پر ہوا ہے۔ اگر بالفرض اس بات کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ (ھکذا امرنا) کا اشارہ عبداللہ بن عباسؓ کے کلام میں اس طرف ہے کہ ایک شہر کی رویت دوسرے شہر کیلئے لازم نہیں، تو علامہ شوکانیؒ اسکے جواب میں فرماتے ہیں: "لو سلم توجه الاشارة فى كلام ابن عباسؓ الى عدم لزوم رؤية لاهل بلد آخر لكان عدم اللزوم مقيدا بدليل العقل وهو ان يكون بين القطرين (البلدين) من البعد ما يجوز معه اختلاف المطالع وعدم عمل ابن عباسؓ برؤية اهل الشام مع عدم البعد الذى يمكن معه الاختلاف فى عدل الاجتهاد وليس بحجة" (نیل الاوطار ۴: ۲۰۶)

ترجمہ: "اگر عبداللہ بن عباسؓ کے کلام میں اشارہ ایک شہر کی رویت دوسرے کیلئے عدم لزوم کی طرف تسلیم کیا جائے تو اس میں عدم لزوم کو دلیل عقل کے ساتھ مقید کرنا لازم آئے گا اور وہ یہ کہ

دو شہروں میں اتنا بعد ہو کہ وہاں تک اختلاف مطالع متحقق ہو جائے، جب کہ عبداللہ بن عباسؓ کا اھل شام کی رؤیت پر عمل کرنا باوجود اسکے کہ وہاں تک اتنا بعد بھی نہیں جو اختلاف مطالع تک پہنچ سکے تو یہ حجت نہیں۔" یہ توجیہ تو ان حضرات کیلئے کافی ہے جو اختلاف مطالع کے اعتبار کو بلاد بعید میں مانتے ہیں۔ قریب میں نہیں مانتے، لیکن جو حضرات ہر شہر کیلئے اپنی اپنی رؤیت کے قائل ہیں تو وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس حدیث میں عدم لزوم رؤیت مقید بالعقل نہیں ہر ایک شہر والوں کے لئے اپنی رؤیت کافی ہے دوسرے کی رؤیت پر اکتفاء کرنا صحیح نہیں، چاہئے شہروں میں بعد پایا جاتا ہو یا نہ اور یہی عبداللہ بن عباسؓ کے قول ھکذا امرنا رسول الخ سے مراد ہے۔

چنانچہ علامہ شوکانیؒ اس کے بارے میں بھی فرماتے ہیں: "ولوسلم عدم لزوم التقيد بالعقل فلايشک عالم ان الادلة قاضية بان اهل الاقطار يعمل بعضهم بخيربعض وشهادته فی جميع الاحكام الشرعية والرؤية من جملتهاوسواء كان بين القطرين من البعدمايجوز معه اختلاف المطالع ام لافلايقبل التخصيص الابدليل لميأت ابن عباس بلفظ النبیﷺ ولابمعنی لفظه حتى ننظرفی عمومه وخصوصه انماجاء نا بصيغة مجملة اشاره بهاالی قصة هی عدم العمل اهل المدينة برؤية اهل الشام علی تسليم ان ذلک المرادولم نفهم منه زيادة علی ذلک حتی نجعله مخصصالذلک العموم (نیل الاوطار: ۴/۲۰۶)

ترجمہ: "اگر عدم لزوم تقید بالعقل کو تسلیم کیا جائے تو کسی سمجھدار کو اس میں کوئی شک نہیں کہ ادلہ اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ دنیا والے ایک دوسرے کی اطلاعات اور شہادت پر تمام احکام شرعیہ میں عمل کرتے ہیں اور رؤیت کا مسئلہ بھی ان ہی احکامات میں سے ہے، چاہے دونوں شہروں میں مسافت دور کا ہو جسمیں اختلاف مطالع ممکن ہو یا نہ ہو، پس کسی چیز کی تخصیص علاوہ دلیل کے قبول نہ کی جائے گی، جبکہ عبداللہ بن عباسؓ نے تقلید کیلئے نبی کریم علیہ السلام کے الفاظ پیش کیے ہیں (تقیدہ) کے ہے اور نہ معنی اور مفہوم ذکر کیا تاکہ ہم اسکے عموم اور خصوص پر نظر رکھیں، بلکہ آپؓ نے ایک مجمل صیغہ ذکر کیا ہے جو اس بات کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ اھل مدینہ نے اھل شام کی رؤیت کو

تسلیم نہ کیا اور اس پر عمل نہ کیا اس کے علاوہ اور کچھ ہمارے ذہن میں نہیں آتا جس سے ہم اس عموم کی تخصیص کریں۔ علامہ شوکانیؒ کا قول اگرچہ وزنی ہے مگر ان لوگوں کے لیے ہے جو قول صحابی کو حجت نہیں مانتے البتہ احناف چونکہ صحابہ کے اقوال کو حجت مانتے ہیں اس لیے انکے ہاں اس روایت کا جواب یہ نہیں بلکہ آئندہ آنے والے ہیں۔

(۲)۔ چنانچہ علامہ ظفر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں: "وھوالمنطبق علی قواعدناو منھاان قول الصحابی حجة عندنا ان واقعة حال ولم ینکشف اجماله فلم یعلم ان ابن عباس بأی وجه ترک فیحتمل ان عدم قبوله شہادة کریبؓ ونقله لروية معاوية لعدم تحقق شرائط القبول المفصلة فی الفروع فانه اذالم یکن غیم لایقبل قول واحدمثلا فلایمکن الاستدلال به (اعلاء السنن ۹/ ۱۰۳)

ترجمہ: "اگرچہ یہ روایت ہمارے قواعد پر منطبق ہے کہ صحابی کا قول ہمارے ہاں حجت ہے، یہ حالی واقعہ سے اجمال منکشف نہیں ہوتا اور اسکی کوئی معلومات نہیں کہ عبداللہ بن عباسؓ نے کیوں اس شہادت کو چھوڑ دیا، پس اس میں یہ احتمال ہو سکتا ہے کہ آپ نے حضرت کریبؓ کی شہادت اور حضرت معاویہؓ کی رؤیت کو اس لئے چھوڑ دیا کہ اس میں فروع کے اندر قبولیت کی شرائط متحقق نہ تھیں، اس لئے کہ جب آسمان ابر آلود نہ ہو تو ایک شخص کی گواہی قبول نہ ہوگی پس اس سے استدلال ممکن نہیں۔ اس لئے کہ جب آسمان کا مطلع صاف ہو کوئی گرد و غبار نہ ہو تو گواہوں کے جم غفیر کا ہونا ضروری ہے۔ صرف ایک یا دو اشخاص کے دیکھنے سے رؤیت ثابت نہ ہوگی چونکہ یہاں پر بھی حضرت کریبؓ فرد واحد تھے اور ممکن ہے کہ مدینہ منورہ کا مطلع اس وقت صاف تھا اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے انکی شہادت کو قبول نہ فرمائی۔

(۳)۔ حضرت العلامہ شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ کا جواب جس کو علامہ عثمانیؒ نے نقل کیا ہے:

"اجاب شیخناالمحمودعن حدیث کریبؓ! بان غرض ابن عباسؓ لیس ردشہادة کریب مطلقاً فی حق ثبوت الصیام بھابل المقصود نفی الاکتفاء بھافی حق الفطرکمایظھرمن قوله فلانزال نصوم حتی نکمل ثلاثین اونراه"

(فتح الملہم ۳/ ۱۱۴)۔ ترجمہ "کہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی غرض حدیث کے باب میں مطلقاً حضرت کریبؒ کی شہادت کو رد کرنا مقصود نہیں تھا کہ اس سے روزے کا وجوب ثابت نہ ہوگا بلکہ آپؓ کا مقصد اس سے یہ تھا کہ ایک آدمی کی شہادت سے افطار کا ثبوت نہیں ہوتا اور یہ بات آپؓ کے قول فلا نزال نصوم حتی نکمل ثلاثین او نراہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ یہ جواب کئی وجوہ سے واضح ہے:

(۱)۔ یہ شہادت افطار کیلئے تھی اور عید کیلئے مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں بھی کم از کم دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے ایک گواہ کی گواہی سے افطار ثابت نہیں ہوتا۔

(۲)۔ اگر چہ لوگوں نے ایک گواہ کی گواہی پر روزہ رکھا ہو تو تیس دن پورے ہونے پر افطار نہ کریں جب تک چاند نہ دیکھیں، اس لیے کہ یہ شہادت رمضان کے ثبوت کیلئے حجت ہو سکتی ہے لیکن افطار کے ثبوت کے لئے ناکافی ہے۔ علامہ کاسانیؒ فرماتے ہیں:

"ألا ترى انه لوشهدوحده مقبولالاتقبل شهادته بخلاف ماذا صاموا بشهادة شاهدين لان نهما شهادة على الصوم والفطرجميعا" (بدائع الصنائع)

ترجمہ: کیا تمھیں علم نہیں کہ اگر کوئی ایک گواہ فطر کی گواہی دے تو اسکی گواہی کو قبول نہیں کیا جائے گا بخلاف دو گواہوں کے جب وہ ثبوت رمضان کے لئے گواہی دیں، اس لئے کہ یہ دونوں گواہ عید و رمضان دونوں کیلئے کافی ہیں۔ یعنی اگر ان دو گواہوں کی شہادت سے رمضان کا ثبوت ہو گیا ہو تو تیس دن مکمل کرنے کے بعد بغیر رؤیت ھلال کے عید منانا جائز ہے۔ البتہ اگر آسمان ابر آلود ہو تو علامہ ابن الکمام کی ذکر کردہ تصریح کے مطابق کہ اس صورت میں بالاتفاق عید منانا جائز ہے۔ (فتح الملہم ۳/ ۱۱۴)۔

(۳)۔ علامہ ابن ھمامؒ کا جواب: فرماتے ہیں اگر حدیث ھذا کا اشارہ اس واقعہ کی طرف ہو جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور حضرت کریبؒ کے مابین پیش آیا تھا تو "لادليل فيه لانه مثل ماوقع من كلامه لووقع لنالم نحكم به لانه لم يشهدعلى شهادة غيره ولاعلى حكم الحاكم" (فتح القدیر ۲/ ۲۴۳)۔ ترجمہ: "اس واقعہ میں کوئی دلیل نہیں اس لئے کہ جو واقعہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے سامنے پیش آیا ہے ہمارے سامنے پیش آئے تو ہم اس پر حکم نہیں دینگے اس

لئے کہ حضرت کریبؓ نے نہ غیر کی شہادۃ پر گواہی دی اور نہ حاکم کے حکم پر گواہی دی تھی۔

(۵)۔ اور علامہ ابن نجیمؒ فرماتے ہیں :

"فلا دليل فيه لانه لم يشهد على شهادة غيره ولا على حكم الحاكم ولئن سلم فلانه لم يأت بلفظ الشهادة ولئن سلم فهو واحد لايثبت بشهادته وجوب القضاء على القاضي"۔(البحرالرائق: ۲/ ۲۷۰)(ترجمہ :اس واقعہ میں اس باب کی کوئی دلیل نہیں اس لئے کہ حضرت کریبؓ نے نہ غیر کی گواہی پر شہادت دی اور نہ حاکم کے حکم پر گواہی دی اگر تسلیم کر بھی لیا جائے تو انہوں نے اسمیں لفظ شہادۃ نہیں کہا اگر اسکو بھی تسلیم کر لیا جائے تو وہ اس میں اکیلے تھے جسکی شہادت سے قاضی پر قضاء کرنا واجب نہیں ہوتا۔ علامہ ابن ہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ ان دونوں محققین فقہاء کرام نے اس روایت کا تین وجوہ سے جواب دیا جو عبارت سے وضاحت کے ساتھ معلوم ہوتا ہے۔

(۷)۔ اس میں ایک توجیہ یہ بھی کی گئی ہے کہ حضرت عباسؓ کے نزدیک اگرچہ اختلاف مطالع معتبر نہیں تھا اور شام کی رویت مدینہ منورہ کیلئے کافی ہو سکتی تھی لیکن چونکہ خبر دینے والے صرف حضرت کریبؓ تھے اور نصاب شہادت موجود نہ تھا اس لئے حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے اسے قبول نہ کیا۔(درس ترمذی ۳/ ۵۳۴)۔

فقیہ العصر شیخ الاسلام مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہ' اس جواب کے بارے میں فرماتے ہیں کہ اگر اس پر یہ اشکال کیا جائے کہ رمضان کے مہینے کے ثبوت کیلئے ایک گواہ بھی کافی ہے تو عبداللہ بن عباسؓ کو حضرت کریبؓ کی شہادت پر عمل کرنا چاہئیے تھا اگرچہ وہ اکیلے تھے۔ فرماتے ہیں اس کا جواب یہ ہے کہ یہ اگرچہ رمضان کے چاند کا معاملہ تھا لیکن چونکہ گفتگو مہینہ کے آخر میں ہو رہی تھی اس لئے اس سے عید کا مسئلہ متعلق ہو گیا تھا اور اس میں ایک شخص کی خبر یا شہادت کافی نہ تھی اور یہاں چاند کی خبر دینے والے صرف حضرت کریبؓ تھے۔ (درس ترمذی ۲/ ۵۳۵)

(جاری ہے)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
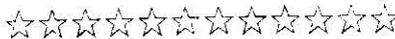
جناب سید العارفین صاحب (راحت آباد پشاور)

رسول کریم ﷺ بحیثیت حکمران

رسول کریم ﷺ کی پوری زندگی بحیثیت حکمران مسلمانوں کیلئے مشعل راہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ آپ کی ذات میں وہ تمام قائدانہ صلاحیتیں بدرجہ اتم موجود تھیں جو کسی کامیاب حکمران کیلئے نہایت ضروری ہیں۔ رسول کریم ﷺ کی نگاہ میں سارے لوگ یکساں رہے اور آپ ﷺ سب کے خیر خواہ تھے۔ آپ ﷺ نے دنیا کے انسانوں کی ہدایت کیلئے جہاں اعلیٰ تعلیمات پیش کیں وہاں ایسے اصول اور قوانین بھی وضع فرمائے جن میں انسانی زندگی کے تمام مسائل کا حل موجود ہے۔ آپ ﷺ پوری انسانی تاریخ اور اسلامی تاریخ میں وہ واحد حکمران ہیں جنکی اصولی حکمرانی امن اور محبت کامیابی و سرفرازی کا ضامن ہے۔ کامیاب حکمران کی نشانی یہ ہے کہ وہ مشکل ترین اور کٹھن حالات میں قوم کی صحیح اور بروقت رہنمائی کرے۔ آپ ﷺ نے انتہائی نامساعد حالات میں ایک عمدہ، اعلیٰ اور مثالی حکومت کی بنیاد رکھ کر بہت قلیل عرصے میں اس مملکت نوزائیدہ کو ہر اعتبار سے استحکام دیا اور کامیاب حکمرانی کا عملی نمونہ پیش فرمایا جو مختصراً کچھ یوں ہے:

(ا) تعلیمی میدان میں: رسول کریم ﷺ نے سب سے پہلے انسان سازی پر توجہ دی اور اس کیلئے تعلیم و تربیت کو ذریعہ بنایا، کیونکہ نظام حیات کی کامیابی کا تمام تر انحصار اس کے نظام تعلیم و تربیت پر ہوتا ہے۔ آپ قوم کو جس راستے پر ڈالنا چاہینگے اس کے مطابق تعلیم و تربیت دینا ضروری ہوتا ہے۔ آپ ﷺ نے انسانوں کو تعلیم و تربیت، توحید و فکر آخرت کے نظریے کے مطابق کیا۔

"اقراء باسم ربک الذی خلق" یہ قرآن حکیم کی پہلی وحی ہے جس سے شریعت اسلامیہ میں تعلیم کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تعلیم و تعلم کی اہمیت کو اجاگر کرنے کیلئے دوسری جگہ استفہام انکاری کے اسلوب میں فرمایا گیا "ھل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون" قرآن کریم نے عالم و جاہل کو برابر قرار نہ دیکر علم کے بلند رتبے کو واضح فرمایا۔ اسلامی معاشرے میں ہر فرد کا حق نہیں بلکہ فرض ہوتا ہے کہ وہ علم حاصل کرے جیسا کہ حدیث نبوی

میں ارشاد ہے :"طلب العلم فریضة علی کل مسلم ومسلمةٍ"دوسری جگہ فرمایا گیا ہے :"انما بعثت معلماً"ھجرت مدینہ کے بعد جب رسول کریم ﷺ نے مسجد نبویؐ کی تعمیر کی تو ایک حصہ درس وتدریس (تعلیم گاہ) کیلئے مخصوص کیا جو صفہ کے نام سے مشہور ہوا۔ اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ دینی تعلیم وتربیت سب سے اول اور افضل ہے۔ جنگ بدر میں قیدیوں سے فدیہ طلب کرنے کی بجائے یہ مطالبہ کیا گیا کہ ہر قیدی دس دس مسلمان بچوں کو لکھنا' پڑھنا سکھادے۔ رسول کریم ﷺ کی اسی توجہ (جو آپؐ نے تعلیم پر دی) کی وجہ سے آپ کے اصحاب گرامی بھی پوری دنیا میں تعلیمی انقلاب لائے۔ انہوں نے جہالت' تاریکی کے خلاف ایک طویل اور کامیاب جہاد کرکے صرف جزیرہ عرب نہیں بلکہ تمام عالم کو منور کیا۔ ان کے بعد بھی امت مسلمہ نے تعلیم وتحقیق کا راستہ اپنایا، اگرچہ بڑے بڑے مدوجزر آئے مگر تعلیمی سفر کا سلسلہ جاری رہا۔ آج کی یہ شاندار جدید سائنسی ایجادات واختراعات اور صناعات کی بنیاد اسی تعلیم کا ثمرہ ہے۔ افسوس یہ ہے کہ امت مسلمہ نے کئی دھائیوں سے دین اور دینی تعلیم وتربیت، تفکر اور تدبر سے منہ موڑلیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ سامنے آیا ہے کہ ہم اقوام عالم میں پست اور سرنگوں ہیں۔ پس چہ باید کرو۔ مسلمانوں کا عقیدہ یہ ہے کہ ان کا رب قادر مطلق ہے، اس لئے فوراً رب کائنات کی طرف رجوع کرے ہمت، بہادری اور توکل کے ساتھ تحقیق، جستجو شروع کریں اور رب کے سامنے اپنی مخلصانہ ندامت کا اقرار کریں اور یہ گویا اب میدان جنگ ہے۔ میدان جنگ میں گھوڑے تیار نہیں کئے جاتے، اب صرف اللہ تعالیٰ کی امداد ہی سے فتح ممکن ہے، لیکن یہ امداد بشرط توبہ نصوحاً آئیگی۔

اسلامی تعلیم وتربیت کا اندازہ آپ اس واقعہ سے بخوبی لگاسکتے ہیں :

مشہور مقرر برک پارلیمنٹ میں تقریر کررہا تھا اور اس کا بھائی کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا تھا کسی ممبر نے اس کا شانہ ہلا کر پوچھا۔ کس سوچ میں ہو خیر تو ہے ؟اس نے جواب دیا :"برک میرا بھائی ہے میں سوچ رہا ہوں کہ اس نے کس طرح ہمارے سارے خاندان کی دماغی قوت پر قبضہ کرلیا ہے۔ ممبر نے دوسرا سوال کیا۔ پھر کس نتیجہ پر پہنچے ؟جواب ملا : اس نتیجہ پر کہ جب ہم کھیل میں یا گپ شپ میں مشغول ہوتے تھے یہ کسی نہ کسی کتاب کے مطالعہ میں مشغول ہوتا تھا۔

(۲) اخلاقی تربیت : "انمابعثت لاتمم مکارم الاخلاق" رسول کریم ﷺ کی بعثت ایک ایسے معاشرے میں ہوئی جسکی حالت ہر اعتبار سے ابتر تھی لیکن آپ ﷺ نے اپنے مضبوط اور آہنی ارادے سے اور توکل علی اللہ سے حالات کا مقابلہ جرأت ایمانی سے کیا اور آپ کی کوشش یہ رہی کہ افراد کی باطنی (معنوی) و ظاہری تربیت ہو۔ آپ ﷺ اچھی طرح جانتے تھے کہ معاشرے میں اس وقت تک کوئی عظیم تبدیلی نہیں آسکتی جب تک لوگوں کے دلوں میں فکر آخرت کی بنیاد پر اخلاقی اقدار کی آبیاری نہ کی جائے اور مادہ پرستی کے تمام رجحانات کی حوصلہ شکنی اور قلع قمع نہ ہو۔ یہ بات قابل غور ہے کہ دوسرے مذاہب میں بھی انسانی اوصاف واخلاق کا ذکر موجود ہے لیکن فرق یہ ہے کہ اسلامی تعلیم نے افراط و تفریط کو چھوڑ کر اعتدال اور توازن کا ایک ایسا راستہ اپنایا ہے کہ اگر اس پر عمل ہو جائے تو بلاشک معاشرے میں امن وسکون اور محبت واخوت کا دور دورہ ہوگا۔ سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے بحیثیت حکمران ایک ایسے مثالی معاشرے کو دنیا کے سامنے پیش فرمایا جس کے ہر پہلو میں باہمی ہمدردی، احسان وایثار، شجاعت وبہادری، صبر وشکر، حلم وبردباری، عفو درگذر، سخاوت اور فیاضی، حسن خلق اور صدق وحیا جیسی صفات مجتمع تھیں۔ حضور اکرم ﷺ نے اخلاقی تربیت پر خاص توجہ دی۔ اپنی حکومتی مشنیری کو ہمیشہ تبلیغ ودعوت، تزکیہ نفس پر مامور کیا۔ غیر مسلموں کو دعوت الی اللہ دینے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی عبادات اور ایمانیات میں پختگی پیدا کرنے کی کوشش کے علاوہ اخلاقیات عالیہ کا درس دیا جاتا رہا۔ کیونکہ اسلام نے ایمانیات کو اولیت اور فوقیت دی ہے لیکن بہترین اعمال کی نشانی کو بہترین اخلاق قرار دیا گیا ہے اور اسلام کے پھیل جانے کا مؤثر ترین ذریعہ بھی مسلمانوں کا اعلیٰ اخلاق اور کردار رہا۔ ہر آدمی اپنے دین وطن کا نمائندہ، سفیر وداعی ہوتا ہے۔ اگر ہم اپنے معاملات، معاشیات اور معاشرت میں حسن اخلاق کا نمونہ پیش کریں تو بلاشک ہم دعوت دین کی خدمت خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں۔ قرآن کریم میں اس کے متعلق مستقل اور مسلسل حکم موجود ہے "ولتکن منکم امة یدعون الی الخیرو یأمرون بالمعروف وینھون عن المنکر "(ویسارعون فی الخیرات(الآیة) امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

کا فریضہ وہی انجام دے سکتے ہیں جو خود اعلیٰ کردار و اخلاق کے حامل ہوں۔ مسلمان کو ان صفات سے معمور ہونا لازمی ہے کیونکہ قیامت تک مسلمان کا یہی فریضہ منصبی ہے یہ فریضہ عالم کی حیثیت ،ڈاکٹر، انجینئر، جیالوسٹ اور کوئی بھی حیثیت سے ہو اس پر واجب ہے۔

(۳) اہل لوگوں کو امانت دینا۔اور انکو مناصب پر فائز کرنا : قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے :"ان الله یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا"اس آیت کریمہ میں لفظ امانت بصیغہ جمع استعمال ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ امانت کا مفہوم صرف مال کی حفاظت تک محدود نہیں جسے عام طور پر امانت کہا جاتا ہے یا سمجھا جاتا ہے، بلکہ یہ لفظ ایک وسیع معنی پر مشتمل ہے جس میں حکومتی عہدے اور مناصب بھی شامل ہیں۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی امانتیں ہیں انکے امین وہ حکام اور افسر ہیں جن کے ہاتھ عزل ونصب کے اختیارات ہیں۔ شریعت کی رو سے ان کیلئے جائز نہیں کہ کوئی عہدہ یا منصب کسی ایسے شخص کے حوالے کردیں جو اپنی علمی و عملی قابلیت کے اعتبار سے اس کا اہل نہیں، بلکہ لازم ہے کہ اپنے دائرہ حکومت میں مستحق افراد کو تلاش کریں۔ رسول کریم ﷺ کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کو عام مسلمانوں کی کوئی ذمہ داری سپرد کی گئی ہو پھر اس نے کوئی عہدہ کسی شخص کو محض دوستی و تعلق کی بنیاد پر بغیر اہلیت کے دیا ہو اس پر اللہ کی لعنت ہے نہ اس کا فرض قبول ہے نہ نفل یہاں تک کہ وہ جہنم میں داخل ہو جائے "(جمع الفوائد، ص ۳۲۵) امانت کی کئی قسمیں ہیں : ایک یہ ہے حدیث مبارک ہے کہ "المجالس بالامانة "یعنی مجلسیں امانتداری کے ساتھ ہونی چاہئیں۔ مطلب یہ کہ مجلس میں جو بات کہی جائے وہ اس مجلس کی امانت ہے۔ اھل مجلس کی اجازت کے بغیر دوسروں کو نقل کرنا اور پھیلانا جائز نہیں۔ دوسری قسم حدیث مبارک ہے "المستشار مؤتمن "یعنی جس شخص سے کوئی مشورہ لیا جائے وہ امین ہے۔ اس پر لازم ہے کہ مشورہ وہی دے جو اس کے نزدیک مشورہ لینے والے کے حق میں مفید اور بہتر ہو، بصورت دیگر امانت میں خیانت ہو گی۔

رسول کریم ﷺ نے اپنے دور میں مناصب اھل لوگوں میں تقسیم کئے اور جب ایک موقع پر ابوذر غفاریؓ نے رسول کریم ﷺ سے حکومت کے کسی منصب کیلئے درخواست کی تو اس

کے جواب میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ "حکومت کا یہ منصب ایک امانت ہے اور آپ کمزور آدمی ہیں ان ذمہ داریوں کو پورا کرنا آپ کے بس میں نہیں" چنانچہ وہ منصب ان کو سپرد نہیں کیا گیا۔ ایک اور حدیث میں ارشاد ہے کہ "جب امانت کو ضائع ہوتا دیکھو تو قیامت یا تباہی کی گھڑی کا انتظار کرو۔ کسی نے عرض کیا حضور ﷺ امانت کے ضیاع ہونے کا مطلب کیا ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا "جب امارت یا امور حکومت کے مناصب نااہل افراد کو سونپے جائیں تو قیامت یا تباہی و بربادی کی گھڑی کا انتظار کرو" اب اگر ہم قوم کی تربیت ان تعلیمات کی روشنی میں کریں تو معاشرے میں اصلاح کی انقلابی بہت بڑی تبدیلی آئے۔ اسکا ایک عظیم فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اندرونی انٹیلی جنٹس کی ضرورت کم ہو کہ اخراجات میں بچت ہوگی اور قومی رازوں کے افشا ہونے کا راستہ محفوظ ترین بن جائے گا۔

شوریٰ اور مشاورت : اس کے باوجود کہ رسول کریم ﷺ عقل و فراست میں تمام عالم کے عقل سے بالا اور اعلیٰ تھے اور آپ ﷺ نزول وحی کی وجہ سے کلیۃً مشورہ سے متسغنی تھے مگر امت کی تعلیم اور مشورے کی افادیت کے پیش نظر اور آئندہ قائدین اور حکمرانوں کی رہنمائی کیلئے آنحضرت محمد ﷺ کو ارشاد فرمایا گیا کہ "وشاورھم فی الامر" محسن انسانیت نے اس حکم ربانی پر پورا عمل کر کے مسلمانوں کو راستہ دکھادیا اور خود بھی اس پر سختی سے کاربند رہے۔ آپ ﷺ نے ہر فیصلہ کرنے سے پہلے ایسے اشخاص سے مشورہ کیا جو مشورہ دینے کے اہل ہوتے۔ حضرت ابوھریرہؓ فرماتے ہیں "مارأیت احداً اکثر مشورہ من رسول اللہ ﷺ" "آنحضرت محمد ﷺ سے زیادہ مشورہ کرنے والا میں نے کسی کو نہیں دیکھا" رسول کریم ﷺ ہر موقع پر اپنے عزیز صحابہ کرامؓ سے مشورے کرتے رہے، مثلاً غزوہ بدر کے موقع پر اسلامی فوج جس جگہ خیمہ زن تھی اس جگہ کے متعلق حباب بن منذر نے آپ ﷺ سے دریافت فرمایا کہ "کیا اس جگہ کا تعین وحی سے کیا گیا ہے یا جنگی تدبر اور آپؐ کی ذاتی رائے ہے؟ اگر پہلی صورت ہے تو "امنا و سلمنا" اگر دوسرا پہلو ہے تو جنگی حکمت عملی اس کا یہ ہے کہ ہم پانی کے چشموں پر قبضہ کرلیں تاکہ دشمن کو ضرورت کے وقت پانی میسر نہ ہو۔ حضور ﷺ نے انکی اس تجویز کو پسند فرما کر اس پر عمل کیا۔ اسی طرح بدر کے قیدیوں کے متعلق فیصلہ کرنے میں آپ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورے کیئے،

غزوہ اُحد اور غزوہ خندق کے موقع پر بھی مشورے فرماتے رہے جن کی تفاصیل کتب سیرت میں موجود ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ مشورے میں فرد اور قوم کی ہر گونہ کامیابی کا راز مضمر ہے۔ ایک بڑا فائدہ یہ ہے کہ کسی مسئلے کے تمام پہلو روشن ہو جاتے ہیں اور اس کو قبولیت عام مل جاتی ہے جس کے بعد ہر فرد اسی حکمت عملی کو کامیاب بنانے کیلئے سر توڑ کوشش کرتا ہے......

آج بھی ہمارے حکمرانوں کو ملکی اور بین الاقوامی بحرانوں سے نکلنے کیلئے اسی اسوہ حسنہ کو اپنانا چاہیئے۔ اپنی ذاتی، گروہی، مسلکی، رائے اور مفادات کو کسی صورت میں دوسروں پر مسلط نہ کی جائے بلکہ سب کاموں میں اھل علم ودانش کے مشورے کو اہمیت دی جائے۔ مغرب کی اندھی تقلید کو چھوڑنا چاہیئے جہاں رائے دینے میں صاحب علم وبصیرت اور جاہل یکساں حق رکھتے ہے ہمارے ملک میں شورائی نظام کا ایک تجربہ مرحوم ضیاء الحق ؒ کے دور میں ہوا لیکن بیوروکریسی کی سازش اور ناتجربہ کاری کی وجہ سے اراکین شوریٰ کے انتخاب میں کوتاہیاں ہوئیں جس کا اقرار خود ضیاء صاحب نے کیا۔ شورائی نظام کی بدولت اخراجات میں کمی واقع ہو جاتی ہے ہر میدان میں ماہر لوگوں کی شمولیت کی بدولت صحیح سمت میں اقدامات کی امید ہوتی ہے......

اقتصادی میدان میں : رسول اکرم ﷺ نے جب دیکھا کہ آپ ﷺ کی اسلامی ریاست اپنے آغاز میں معاشی مشکلات سے دوچار ہے، مہاجرین مکہ کی تجارت منقطع ہو چکی ہے اور انصار مدینہ پر بڑی حد تک یہودیوں کی معاشی بالادستی قائم ہے تو انہوں نے اسلامی مملکت کی بقا اور باہمی امداد کی بنیاد پر جو فوری قدم اٹھایا اسے مواخات کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اسی طرح ایک بڑی معاشی بحران پر قابو پالیا گیا اس کے بعد آہستہ آہستہ سودی کاروبار کے خاتمے کیلئے اقدامات ہوتے رہیں۔ یہاں تک کہ سود کا خاتمہ کر کے غیروں کی اجارہ داری ختم فرمائی اسی طرح تجارتی راستے پر آزاد قبائل سے (جو ابھی مسلمان نہیں ہوئے تھے) امن کا معاہدہ کیا جس کے نتیجے میں مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو گئے اور غیروں کی غلامی سے نجات پا گئے۔ رسول اکرم ﷺ نے تجارتی بدعنوانیوں کی روک تھام کیلئے مختلف افراد کو بازاروں میں نگران مقرر کئے۔ ذرائع نقل وحمل کو آسان بنادیا۔ پیامبر اسلام نے تجارت کے ساتھ ساتھ زراعت پر بھی خاص توجہ دی اور اسکی ترقی کیلئے دور رس اقدامات

فرمائے۔ آپ ﷺ نے مدینہ کی بنجر زمینوں کو سرکاری تحویل میں لیکر انکو زرخیز بنادیا۔ کچھ زمینوں کو ضرورت مندوں پر تقسیم کیا تاکہ وہ انکو آباد کر کے ذریعہ معاش بنائیں۔ آپ ﷺ کا فرمان ہے "جو شخص کسی مردہ زمین کو آباد کرے وہ اسکی ملکیت ہے" اسیطرح حیوانات کی افزائش اور پرورش کے سلسلے میں بھی آپ ﷺ نے مؤثر اقدامات فرمائے اور بڑی دلچسپی سے اس شعبے کو فروغ دیا یہاں تک کہ خود بھی جانور پالے، مدینہ میں آپکے پاس کئی دودھ دینے والی اونٹیاں اور بکریاں تھیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا" جن لوگوں کے ہاں بکری ہے انکے ہاں برکت ہے" رسول کریم ﷺ نے پرانی چراگاہوں کی از سر نو حفاظت کی اور نئی چراگاہوں کو آباد کرنے کا اہتمام کیا۔ اس کے ساتھ ساتھ آپ ﷺ نے حمی کے درختوں کو کاٹنے سے منع فرمایا۔ آج ہم اپنے معاشی نظام میں بری طرح ناکام ہیں کیونکہ سودی نظام کا شکنجہ ، فضول خرچیوں کا شوق، غیر ضروری اخراجات اور قرضوں میں ہم محصور ہیں۔ ہماری حالت اب یہ ہوچکی ہے کہ ہم دو کروڑ روپے فی گھنٹہ کے حساب سے سود ادا کر رہیں، یہ الٰہی احکام سے روگردانی کی سزا ہے اور اسوۂ حسنہ کے مخالف عمل کا نتیجہ ہے۔

بیت المال کا قیام : کوئی حکومت بغیر دولت کے قائم نہیں رہ سکتی، خزانہ بہت اہم چیز ہے۔ بیت المال اسلامی حکومت کے خزانے کا اصطلاحی نام ہے، حکومت جو کچھ وصول کرتی ہے وہ اس میں آتا ہے اور جو کچھ خرچ کرتی ہے وہ اسی میں سے کرتی ہے۔ محاصل (ٹیکسیں) جو بیت المال کے ذرائع آمدنی ہیں صرف حکومت کے اخراجات پورا کرنے کیلئے نہیں بلکہ اس کا بڑا مقصد معاشی توازن کا قیام بھی ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ربانی ہے :

"ماافاء الله علی رسوله من اهل القریٰ فلله وللرسول ولذی القربیٰ والیتمیٰ والمساکین وابن السبیل کی لایکون دولة بین الاغنیاء منکم"

بعض محاصل میں اللہ تعالیٰ نے حکمرانوں کو بھی کمی وبیشی کا اختیار نہیں دیا ہے جیسے عشر وزکوۃ چونکہ زکوۃ اور عشر عبادات میں داخل ہیں اور عبادات میں کسی قسم کی تبدیلی کا حق کسی امتی کو نہیں ہے۔ اسلام دولت اور ذرائع دولت دونوں کو اللہ تعالیٰ کے ملک قرار دیتا ہے۔ انسان اس کا مالک نہیں بلکہ ظاہراً قابض ہیں اس لئے لازم ہے کہ وہ جتنے تصرفات اس میں کرتا ہے وہ احکام شریعت کے مطابق

ہوں۔ ان احکام کی خلاف ورزی جرم ہے۔ حکومت بھی اس آمدنی میں وہی تصرفات کر سکتی ہے جو قوانین شریعت کے مطابق ہوں۔ رسول کریم ﷺ نے فلاحی کاموں کیلئے بیت المال کی بنیاد رکھی اور مختلف ذرائع سے حاصل شدہ رقم کو بیت المال میں جمع کر کے لوگوں کو ضرورت کے وقت دیا کرتے تھے۔ رفاہی کاموں میں خرچ کئے۔ عطیات بھی اسلام میں محبوب فعل ہے مثلاً حضرت عثمانؓ نے رسول اکرم ﷺ کے خواہش پر مدینہ میں پانی کا انتظام کیا۔ انصار مدینہ نے باغات اور زمین مہاجرین میں عطیات کی شکل میں تقسیم کیے۔ ہوازن کے چھ ہزار قیدیوں کیلئے کپڑے مسلمانوں کے عطیات سے فراہم کیے گئے۔

داخلی اور خارجی امن واستحکام : رسول کریم ﷺ نے اسلامی ریاست کے داخلی امن پر پوری توجہ دی۔ قوموں کے حقوق اور فرائض کا تعین فرمایا۔ افراد کے حقوق اور ان کے واجبات کو یقینی بنایا۔ فساد کرنے والوں کے خلاف سخت کاروائی فرمائی۔ آپ ﷺ نے حکومتی اداروں کو مضبوط کیا۔ نظام زکوۃ، بیت المال، عدل کی فراہمی، احتساب، خدمت خلق کو عملاً نافذ کر دیا اور ہر جگہ آپ نے مقامی آدمیوں کی تقرری فرمائی تاکہ اخراجات بھی کم ہوں اور مسائل بھی واقفیت کی بنا پر حل ہوں۔ بعض حقوق وفرائض ایسے ہوتے ہیں جو قومی یا علاقائی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں۔ اگر ان کی طرف صحیح اور بروقت توجہ نہ دی جائے تو ملک میں عدم استحکام کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں رسول کریم ﷺ نے ابتداہی سے خصوصی توجہ فرمائی۔ چنانچہ اسلامی ریاست کی بنیاد رکھتے ہی مختلف قبائل کے درمیان حقوق وفرائض کا صحیح تعین فرمایا۔ رسول اکرم ﷺ نے انصاف رسانی کا انتہائی مستحکم ادارہ قائم فرمایا جس کے تحت ہر بڑے چھوٹے، امیر وغریب، کو عدل کی بنیادوں پر انصاف مہیا کیا جاتا تھا، اسکی مثال خود نبی کریم ﷺ نے قائم فرمائی چنانچہ ایک مرتبہ اپنی آخری عمر میں آپ نے اعلان فرمایا کہ مجھ پر کسی کا حق ہو تو وہ طلب کر لے اور جس کسی کو مجھ سے تکلیف پہنچی ہو، وہ مجھ سے انتقام لے، آپ ﷺ نے سب کو بلا تفریق انصاف مہیا کیا، چنانچہ سب لوگ مسلم اور غیر مسلم آپ کی طرف رجوع کر کے آپ سے بخوشی فیصلے کراتے تھے۔ رسول کریم ﷺ نے اسلامی ریاست کے داخلی استحکام کو بحال رکھنے کے ساتھ ساتھ بیرونی خطرات سے

مدافعت کا انتظام بھی فرمایا۔ آپ ﷺ نے جدید ترین ہتھیار حاصل کیے اور ان کا استعمال بھی فرمایا۔ آپ نے کھیلوں اور ورزشوں کی حوصلہ افزائی فرمائی جو جنگ کیلئے مفید ہو سکتی ہیں مثلاً نیزہ بازی، تیر اندازی اور تیراکی گھوڑ سواری وغیرہ۔ آپ ﷺ نے مخالفین کی معاندانہ سرگرمیوں کی اطلاع حاصل کرنے کیلئے جاسوسی کا انتظام فرمایا تھا۔ ابن ھشام نے لکھا ہے کہ قبیلہ بنو خزاعۃ آپ ﷺ کیلئے جاسوسی بھی کرتا تھا۔ شامی میں ہے کہ غزوہ خندق کے محاصرے میں قریش کی مسلمانوں کے خلاف جنگی تیاریوں کی اطلاع بھی بنو خزاعۃ نے نبی کریم ﷺ تک پہنچائی تھی۔ خارجی امن واستحکام کے ضمن میں آنحضرت محمد ﷺ کے وہ معاہدے بھی شامل ہیں جو آپ نے اسلامی ریاست کے قیام کے فوراً بعد کیے جو بنو ضمرہ، بنو مدلج، بنو اسلم، بنو کلب اور بنو خزاعۃ جیسے قبائل سے ہوئے تھے۔ یہ معاہدات بہت ہی کارگر ثابت ہوئے۔

بلاشک رسول کریم ﷺ کی سیرت ہمارے لیے سب سے بہترین معیار ہے، جو زندگی کے کسی بھی شعبے میں ہماری ترقی اور کامرانی کا سبب اور ضامن ہے اور اسی سیرت طیبہ ہی کے ذریعے سے ہم اجتماعی فلاح اور ترقی کی منزلیں طے کر سکتے ہیں۔ اگر ہمارے حکمران رسول کریمؐ کی سیرت طیبہ اور آپکی طرز حکمرانی کا شیوہ اپنالیں تو کوئی شک نہیں کہ ہماری مشکلات فوری طور پر دور ہو جائینگی۔ کیونکہ رسول کریم ﷺ وہ واحد حکمران تھے جو ہر ٹیڑھے کو سیدھا کرنے والا، ہر کج رو کو سیدھی راہ پر لانے والے تھے، ہر فاسد کی اصلاح، ہر ضعیف کی قوت، ہر مظلوم کیلئے انصاف ہر غمزدہ کیلئے ملجا تھے۔ رسول کریم ﷺ نے اس باپ کی طرح حکمرانی فرمائی جو اپنی اولاد کی ہر طرح دیکھ بھال کرتا ہے۔ اولاد چھوٹی ہوتی ہے تو ان کیلئے دوڑ دھوپ کرتا ہے، سیانی ہو جاتی ہے تو ان کو تعلیم دیتا ہے، زندگی بھر ان کیلئے کماتا ہے اور مرتے وقت سب کو چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جناب مولانا قاضی عبداللطیف صاحب

اعلان لاہور۔۔۔ عظمت وطن کی پامالی

بھارت کے وزیراعظم واجپائی کا پاکستانی دورہ پاکستان کے عوام کے خواہشات اور جذبات کے علے الرغم تکمیل پذیر ہوا۔ دورہ سے قبل ملے جلے خدشات اور توقعات کا اظہار ایک قدرتی امر تھا لیکن دونوں ممالک کے وزیراعظم کے مشترکہ پریس کانفرنس اور اعلان لاہور نے خدشات کی تصدیق کے بغیر اہل پاکستان کو کچھ حاصل نہ ہوا۔ پریس کانفرنس اور اعلامیہ میں اقوام متحدہ کے قراردادوں کو نسیا منسیا کر کے کشمیر کے مسئلہ کے اصل بنیاد کو متزلزل کر دیا۔ قائداعظم کے اعلان کے مطابق کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اقتصادی استحکام کے علاوہ نظریاتی اور تقسیم کے اصول کے فلسفے کے لحاظ سے بھی کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے اور موجودہ حالات میں جغرافیائی حیثیت سے بھی کشمیر کے بغیر پاکستان ادھورا ہے۔ پاکستان کے سابقہ سیاستدانوں نے کشمیر کی نمائندگی میں بہت ظلم کیا تھا حتیٰ کہ سلامتی کونسل اسے بوسیدہ ناکارہ، لاوارث مسئلہ سمجھ کر ایجنڈے سے اخراج کے تجاویز مرتب کر رہا تھا، جبکہ پاکستان کے ۲۸ مئی ۹۸ء کے ایٹمی دھماکہ نے عالمی سطح پر بھونچال پیدا کر کے کشمیر کے ایک کروڑ بیس لاکھ کی آبادی کی قسمت کو جگانیکا الارم دیدیا۔ دنیا کی بڑی ایٹمی طاقتوں کو اپنی سپروائزری میں دراڑیں محسوس ہونے لگیں۔ عالمی طاقتوں کو پہلی مرتبہ محسوس ہوا کہ جنوبی ایشیاء میں واقعہ کشمیر ایشیاء کا آتش فشاں ہے جو تمام دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے سکتا ہے۔ مغربی ایوانوں میں تزلزل برپا ہوا، بھارت کا غرور خاک میں مل گیا۔ امریکی سفار تکاروں اور وزرات خارجہ نے جنوبی ایشیاء کی دوڑیں لگادیں۔ پاکستان کی پچاس سالہ کارکردگی نے پاکستان کے شہ رگ کو جس مردنی کی پوزیشن تک پہنچادیا تھا ۲۸۔ مئی ۹۸ء کے اقدام نے سب کی تلافی کر کے نہ صرف پاکستان بلکہ تیسری دنیا کی زندگی کا ثبوت مہیا کر دیا۔ امریکہ کی عالمی یلغار کو حقیقتاً کامیاب چیلنج تھا جس پر امریکہ نے دھونس دھمکی منت سماجت اور خوشامد کے تمام

حربے استعمال کر کے پاکستان کو اپنے ڈھب پر لایا جس پر ۲۰۔ فروری ۹۹ء کی دونوں ممالک کے وزراء اعظم پریس کانفرنس اور مشترکہ اعلامیہ واضح شہادۃ مہیا کر رہا ہے۔ اگر مسئلہ کشمیر سمیت دونوں ممالک اپنی تمام متنازعہ مسائل باہمی مذاکرات اور دوستی کے انداز میں حل کر سکتے ہیں تو پھر دوسری دنیا اور اقوام کو اس میں دخل دینے کا شوق کیوں پیدا ہو؟ اس اعلان نے پاکستان کی ابھرتی ہوئی ساکھ کو زمین بوس کر دیا۔ امریکہ کو تیسری دنیا اور مشرق وسطیٰ میں اپنی جارحانہ عزائم کی تکمیل کیلئے کوئی خطرہ باقی نہیں رہا۔ بھارت کی جارحیت کے خطرے کو خود پاکستان نے واہمہ کی حیثیت عطاء کر دی اور اب اپنے دفاع کے خدشات کو موہوم خطرہ کے حیثیت سے زیادہ وقعت حاصل نہ رہی۔ اعلان لاہور نے پاکستان کے حاصل کردہ وقار اور عظمت کو بری طرح پامال کر دیا۔ پاکستان کے مذہبی طبقات کو اس بدترین پامالی کا کوئی مداوا سوچنے کا فرض ہے کہ امریکی یلغار کو روکنے کیلئے ایشیاء میں چین کو ان مظلوم پستے ہوئے خطے کی قیادت کی ضرورت ہے۔ جغرافیائی لحاظ سے چین کی سرحدیں ان تمام مظلوم اقوام اور ممالک کے ساتھ وابستہ ہیں اگر چین نے ان مظلوم اقوام اور ممالک کو امریکہ کی یلغار کیلئے تنہا چھوڑا تو کل چین پر بھی امریکہ سے رحم کی توقع محض سراب ہوگی۔ ضرورت ہے کہ چین اپنے ہمسایہ ممالک کے ساتھ بروقت دفاعی لائن کا تعین کر کے امریکی جارحیت کے خواب کو شرمندہ تعبیر نہ ہونے دے اور چین کو اپنے ہمسایہ ممالک کے نظریاتی جذبات کا احترام کرتے ہوئے اپنے دفاع کو مستحکم کرنا ہوگا اور یہ خیال کرنا ہوگا کہ کوئی ملک اپنے نظریاتی جذبات قربان کر کے دل وجان سے اسکے ساتھ تعاون کیلئے امادہ نہیں ہوگا۔ یہ نظریات کی دنیا ہے اسلئے چین کو اس کا احترام لازمی ہوگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆
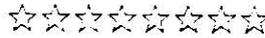
دار العلوم کے شب و روز

جناب شفیق الدین فاروقی صاحب

عید الاضحیٰ کے موقع پر حضرت مہتمم صاحب مد ظلہ کا تاریخی خطاب :

اکوڑہ خٹک اور گرد و نواح کی مرکزی عظیم عید گاہ میں حضرت مولانا سمیع الحق صاحب مد ظلہ نے ایک لاکھ سے زائد افراد سے ایک تاریخی خطاب فرمایا۔ جس میں امت مسلمہ کو در پیش صور تحال پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی۔ اور خصوصاً کوسوؤ کے مسلمانوں پر سرب درندوں کے مظالم کی پر زور مذمت بیان کی۔ حضرت مہتمم صاحب مد ظلہ نے اپنے خطاب میں طالبان افغانستان کی بھر پور حمایت کا اعادہ کیا اور امریکہ اور عالم کفر کی طالبان افغانستان کے خلاف بڑھتی ہوئی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کو بے نقاب کیا۔

سفیر افغانستان مولانا سعید الرحمٰن حقانی کی دار العلوم تشریف آوری :

عید الاضحیٰ کے موقع پر دار العلوم حقانیہ کے قابل فخر فرزند جناب مولانا سعید الرحمٰن حقانی صاحب عید الاضحیٰ کے مبارک دن دار العلوم حقانیہ میں اساتذہ اور طلباء کے ساتھ گزارنے کیلئے تشریف لائے۔ آپ نے تمام سرکاری پروٹوکولز کو بالائے طاق رکھ کر نماز عید میں شرکت فرمائی اور حضرت مہتمم صاحب مد ظلہ ' کے گھر پر افغانستان کے بارے میں تفصیلی بات چیت کی۔ اس موقع پر نائب مہتمم مولانا انوار الحق صاحب مد ظلہ اور جناب مولانا حامد الحق حقانی صاحب بھی تشریف فرما تھے۔

امریکہ کے قومی ریڈیو کے پروڈیوسر کی دار العلوم آمد :

دار العلوم حقانیہ کی عالمگیر خدمات اور خصوصاً جہاد افغانستان اور تحریک طالبان کے بیس کیمپ (جی ایچ کیو) کی شہرت نے پورے عالم کفر کی نیندیں حرام کر کے رکھ دی ہیں۔ گذشتہ تین سالوں سے بین الاقوامی پریس کی درجنوں ٹیمیں دار العلوم آچکی ہیں۔ اور حضرت مہتمم مد ظلہ سے متعدد انٹرویوز ریکارڈ کر کے نشر کر چکے ہیں۔ امریکہ کے تمام بڑے اخبارات اور اسکے سب سے بڑے ٹی وی چینل سی این این نے بھی آپ کا انٹرویو نشر کیا ہے۔ اس بار امریکہ کے قومی ریڈیو کی ٹیم دار العلوم آئی اور مختلف طلباء سے انٹرویوز ریکارڈ کرائے۔ کئی طلباء نے انگریزی زبان میں انٹرویو ریکارڈ کرائے۔ ماہنامہ الحق کے مدیر مولانا راشد الحق نے انہیں دار العلوم کا معائنہ کرایا۔ اس کے

بعد آپ سے ۴۵ منٹ کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کرایا۔ جس میں سرفہرست افغانستان کی صورتحال، جہاد افغانستان، تحریک طالبان کے ساتھ دارالعلوم کا کردار، عالم اسلام کی صورتحال اور عالم اسلام کے عظیم مجاہد اور ہیرو اسامہ بن لادن کی شخصیت سرفہرست تھی۔ آئندہ ماہ امریکہ سے افغانستان اور مدارس کے کردار کے حوالہ سے یہ رپورٹ اور انٹرویو نشر کیا جائیگا۔

وفیات: دارالعلوم کے ایک انتہائی مخلص جناب صاحبزادہ صاحب کو صدمہ

گذشتہ دنوں دارالعلوم حقانیہ اور حضرت مولانا عبدالحق صاحب رحمہ اللہ کے ایک انتہائی مخلص اور معتقد جناب صاحبزادہ صاحب کے والد صاحب مختصر علالت کے بعد انتقال فرماگئے۔ مرحوم انتہائی پاکباز اور نیک انسان تھے۔ تبلیغی جماعت کے ساتھ عمر بھر وابستہ رہے۔ علالت کے دوران بھی تبلیغی جماعت کے ساتھ رہے۔ اور اسی دوران آپ پر فالج کا جان لیوا حملہ ہوا۔ ہسپتال میں ایک دوروز رہنے کے بعد آپ کا انتقال ہوا۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون) مرحومؒ کی نماز جنازہ میں علاقہ بھر سے کثیر تعداد میں علماء اور مختلف شخصیات کے علاوہ دارالعلوم کے اساتذہ اور طلباء کی اکثریت نے شرکت کی۔ مرحومؒ ماہنامہ الحق کے ناظم جناب نثار محمد صاحب کے رشتہ میں چچا تھے۔ ماہنامہ الحق اور دارالعلوم حقانیہ اس غم میں پسماندگان کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اللہ تعالیٰ مرحومؒ پر اپنی رحمتیں نازل فرمائیں۔

دارالعلوم کے خادم محمد شریف کو صدمات: جامعہ کے پرانے مخلص خادم محمد شریف صاحب کو گذشتہ ماہ پے درپے دو بڑے حادثے پیش آئے۔ پہلے ان کی بڑی بہن کا اچانک انتقال دارالعلوم میں ہی ہوا۔ مرحومہ اپنی بیمار ماں کی عیادت کے سلسلہ میں چارسدہ سے آئیں اور آتے ہی اپنی ماں کے پیروں میں آکر سر رکھ دیا۔ عیادت کرنے کے بعد آپ نے اپنے سینے میں درد اٹھنے کی شکایت کی۔ اور آہستہ سے اپنی ماں کی آغوش میں اپنی جان جان آفریں کے سپرد کردی۔ (اناللہ وانا الیہ راجعون)۔ اس کے چند روز بعد محمد شریف صاحب کی دوسری بہن کا انتقال بھی مختصر علالت کے بعد ہوا۔ ان دردناک حادثات پر ہم محمد شریف صاحب کے ساتھ دلی تعزیت کرتے ہیں۔ قارئین "الحق" سے بھی ان تمام مرحومین کیلئے دعائے مغفرت کی اپیل ہے۔ ☆☆☆

ادبیات

اے جان من چہ دانی تو کرب آشنائی

رشحات فکر! حافظ محمد ابراہیم فانؔی۔ دارالعلوم حقانیہ

مَن بندۂ نیازم ، تو شاہِ دلربائی
بر تختِ دل نشستی عالم بہ تو فدائی

اے رشکِ سنبل وگل اے نازشِ بہاراں
اے روحِ صد ہزاراں از من جدا چرائی

اِستادہ ام فقیرم بربارگاہِ نازت
از خیر وصل پُر کن ایں کاسۂ گدائی

گر کاروبارِ یاری بارگراں نہ بینی۔
اے جانِ من چہ دانی تو کرب آشنائی

خیرے بکن بجانم اے شمعِ بزمِ غیرے
باہیچ کس نہ بینم ایں گونہ بے وفائی

اے عشق فغاں خیزے اے دردِ دلآویزے
دیدم عجب تضادے داروئی ہم بلائی

نے گوش کس شنیدہ حورانِ خلد نہ دیدہ
ایں شانِ دلآرائی ایں رنگِ کج ادائی

خلقے کند ملامت اے سنگ دل نگارے
جانم بلبم آمد زیں جورِ برملائی

در وصل نالہ ریزم در ہجر جنوں خیزم
"نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی"

فانؔی کہ ناتوانم داغ جگرم ظاہر
مجبور و مضطرب ام برایں فغاں نوائی

ایں غزل بپاس خاطر بعض دوستان وہمدردان نذر قارئین "الحق" کردم
کہ مصرعہ شاعر "نے تابِ وصل دارم نے طاقتِ جدائی را متضمن است (فانؔی)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

مولانا محمد ابراہیم فانی صاحب

الادب الجاری فی ابیات صحیح البخاری۔ مؤلف: شیخ الحدیث مولانا لطافت الرحمان صاحب سواتی
ضخامت: ۱۶۰ صفحات۔ قیمت: درج نہیں۔ ناشر: ادارۃ العلم والتحقیق جامعہ ابوھریرہ، زڑہ میانہ نوشہرہ

زیر تبصرہ کتاب شیخ الحدیث حضرت مولانا لطافت الرحمٰن صاحب سواتی مدظلہ، کی ایک علمی شہکار تالیف ہے جس میں فاضل مؤلف نے بخاری شریف میں جابجا جو اشعار آئے ہیں اس کی تشریح فرمائی ہے مغلق لغات کی تنقیح و توضیح اوزان و بحور کی تفصیل اور ابیات کی تقطیع کے ساتھ ساتھ صرفی و نحوی تحقیق نے اشعار کے غوامض کی نقاب کشائی کی ہے اور پھر اس پر مستزاد یہ کہ مقام و موقعہ کی مناسبت سے اردو اور فارسی کے ابیات کے الحاق سے کتاب کی افادیت میں مزید اضافہ ہوا ہے چونکہ مؤلف موصوف خود بھی عربی کے قادر الکلام شاعر ہیں۔ اس لئے آپ نے ان اشعار کی تشریح میں اپنے مذاق شاعری کے مطابق انتہائی نکھار اور دلچسپی پیدا کی ہے۔ اسی موضوع پر مولانا عاشق الٰہی صاحب بلند شہری نے انعام الباری کے عنوان سے اردو میں کتاب لکھی ہے لیکن اس کا انداز اور اسلوب واعظانہ اور ناصحانہ ہے جبکہ ان اشعار کی ادبی رنگ میں ایک دلکش توضیح کی ضرورت تھی چنانچہ یہ عظیم کارنامہ مولانا لطافت الرحمٰن صاحب مدظلہ، نے بطریق احسن انجام دیا ہے۔ فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔ کتاب جس طرح کہ معنوی لحاظ سے انتہائی مفید اور دلچسپ ہے اسی طرح صوری اور ظاہری اعتبار سے بھی نہایت دیدہ زیب اور خوبصورت ہے۔ کتاب کے عنوان کی مناسبت سے اربابِ ادارۃ العلم والتحقیق نے اسے اس قدر حسین انداز میں پیش کر کے خوش ذوقی کا ثبوت دیا ہے۔ علاوہ ازیں شیخنا المکرم حضرت مولانا ڈاکٹر سید شیر علی شاہ صاحب مدظلہ، کی بلیغ تقریظ نے کتاب کی افادیت کو دوبالا کیا ہے۔

کتاب المرشد۔ مصنف۔ محمد بن زکریا رازی۔ مترجم: جناب محمد رضی الاسلام ندوی صاحب
ضخامت: ۱۴۴ صفحات۔ قیمت: ۳۰/- روپے۔ ملنے کا پتہ: عمران اکیڈیمی ۴۰/بی۔ اردو بازار، لاہور

محمد بن زکریا رازی کا شمار ان عظیم اور نابغہ روزگار اطباء میں ہوتا ہے جن کا طب یونانی کے

فروغ وارتقاء میں غیر معمولی حصہ ہے اور جنہوں نے اپنی زبردست علمی صلاحیت، فنی مہارت اور وسیع و عمیق تجربہ کے ذریعہ اس فن میں قابل قدر اضافہ کیا ہے ان کی شہرہ آفاق تصنیف الحاوی الکبیر فی الطب نہ صرف امہات الکتب میں سے ہے بلکہ اس کے لاطینی تراجم نے یورپ میں طبی علوم کے ارتقاء میں اہم کردار ادا کیا ہے وہ ایک ماہر اور تجربہ کار معالج تھا۔ کلیاتی موضوعات پر رازی کی ایک اہم تصنیف کتاب المرشد ہے۔ مؤرخین طب میں سے ابن ندیم اور البیرونی وغیرہ نے اس کا تذکرہ کیا ہے لیکن طب کی کتابوں میں اس کے حوالے غالباً نہیں ملتے۔ اس کتاب کا لاطینی میں ترجمہ یورپ میں پندرھویں صدی عیسوی میں ہوا تھا۔ جس کے بعد اس کے متعدد ایڈیشن شائع ہوئے۔ لیکن اصل کتاب عربی زبان میں اس کے صرف دو مخطوطوں کا علم ہے اسے منظر عام پر لانے کا سہرا ڈاکٹر البرزکی اسکندر جنہوں نے رازی پر آکسفورڈ یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے کے سر جاتا ہے۔ اس کتاب کی بعض خصوصیات یہ ہیں کہ اس میں رازی نے اپنی عملی مہارت مریضوں کے احوال اور اپنے تجربات وغیرہ شاذونادر ہی ذکر کئے ہیں پوری کتاب طب کے نظری پہلو سے بحث کرتی ہے اپنی اس علمی و تحقیقی کتاب میں رازی نے متعدد دیگر تصانیف کا تذکرہ کیا ہے نیز بقراط جالینوس اور دوسرے اطباء کی بہت سی کتابوں کے بھی حوالے دیے ہیں اور جابجا بقراط اور جالینوس پر تنقید بھی موجود ہیں۔ اس میں بہت سی نفیس بحثیں ملتی ہیں مثلاً طبیعت پر رازی نے قدرے تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے اور امراض میں اس کے کردار کو آشکارا کیا ہے۔ کتاب کی اہمیت اور غیر معمولی خصوصیات کو پیش نظر رکھتے ہوئے جناب محمد رضی الاسلام ندوی صاحب نے کتاب کا سلیس اردو ترجمہ کیا ہے جس سے نہ صرف طبی حلقوں میں اس کی پذیرائی ہو گی جبکہ اس سے رازی کی شخصیت کی صحیح قدروقیمت متعین کرنے میں بھی مدد ملے گی۔

کلمہ اسلام کی حقیقت اور اس کے تقاضے : مرتب : شیخ زادہ حماد الزہراوی۔

ضخامت : ۸۰ صفحات۔ قیمت : ۔/۲۵ روپے۔ ناشر : ندوۃ المعارف گکھڑ گوجرانوالہ

زیر تبصرہ کتاب میں اسلام کی نظریاتی بنیاد کلمہ اسلام کی پر مغز اور فکر انگیز تشریح کی گئی ہے اور اس میں مفکرین ملت کے بیش قیمت فکری اور نظریاتی لٹریچر کا نچوڑ پیش کیا گیا ہے۔ فہرست

کے اہم عنوانات سے اس مختصر رسالہ کی افادیت کا پتہ چلتا ہے۔ کلمے کا لفظی اقرار اور مطالب کی دنیا' کلمے کا پہلا جزء اور اسکے تقاضے توحید فی الذات توحید فی الصفات توحید فی العبادت توحید فی الاطاعت توحید اعتقادی اور توحید عملی' عقیدہ توحید کے انسانی زندگی پر اثرات' کلمے کا دوسرا جزء اور اس کے تقاضے ایمان بالرسول' تعظیم رسول' نصرت رسول' اتباع قرآن' کلمے کے تقاضے اور ہمارا کردار امت کی حقیقت دہ ماہیت' امت مسلمہ کا مقصد تخلیق' اسلام کی نظریاتی بنیاد اور نظریاتی دعوت اور سرکردہ طبقات جیسے اہم عنوانات پر سیر حاصل مباحث موجود ہیں۔

☆☆☆☆☆☆☆

تاریخ الفقہ : مصنف : قاضی ظہور الحسن صاحب۔ ضخامت : ۱۳۶ صفحات۔ قیمت : ۵۰ روپے
ناشر : عمران اکیڈیمی ٹی/۴۰ اُردو بازار' لاہور

فاضل مرتب نے اس رسالہ میں نہایت شرح وبسط سے قیاس اور اجتہاد کی مشروعیت اور اس کی حجیت پر تفصیل سے کلام کیا ہے اور کتاب وسنت وآثار صحابہؓ سے اس کو مبرھن ومدلل کیا ہے۔ یہ بحث بطور خاص قابل دید ہے۔ اس کے بعد حضرات صحابہ وتابعین کے اختلاف کے وجوہ اور اسباب اور اس اختلاف کا سراسر رحمت ہونا تفصیل کے ساتھ بتلایا ہے۔ بعد ازاں قرن صحابہ وتابعین کے ائمہ مجتہدین کے مختصر حالات ہیں اور پھر اس امر کو بھی خوب وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ تقلید کی ابتداء کب ہوئی اور بعد میں خاص ائمہ اربعہ کی تقلید شخصی پر علماء ربانیین کا اجماع کیوں ہوا؟ علاوہ ازیں امام اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کے مذہب کی عظمت کو فاضل مؤلف نے نہایت خوبی سے اجاگر کیا ہے۔ آخر میں دیگر مذاہب کے قوانین اور رومن لاء سے فقہ اسلامی کا تقابل کیا گیا ہے۔ جو کہ اپنے موضوع اور عنوان کے اعتبار سے ایک نفیس بحث ہے۔ الغرض یہ مختصر کتاب انتہائی عرق ریزی اور تحقیق وتجسّس کے بعد مرتب کی گئی ہے۔ البتہ جابجا کتابت کی غلطیاں ہیں جس کی طرف دوسرے ایڈیشن میں توجہ ضروری ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆